بہکی باتیں

(مجموعۂ اشعار)

پروفیسر ایس۔ ایم۔ جمیل واسطی
ایم۔ اے۔ (کینٹب)

عالیہ پبلشنگ ہاؤس
۴۰۔ اردو بازار۔ کراچی

جملہ حقوق بحق مصنّف محفوظ ہیں

بار اوّل ——— اکتوبر ۱۹۶۹ء

تعداد ——— ایک ہزار

تاریخ اشاعت ——— جنوری ۱۹۷۱ء

طباعت ——— حقّی آفسٹ پریس کراچی

کتابت ——— نورالکتابت ۱۰ بہادر شاہ مارکیٹ کراچی

قیمت ——— سات روپے ۷۵ پیسے (7.75)

سول ایجنٹ ——— ڈان بک ہاؤس
فوجداری روڈ، حیدرآباد

فہرست

پیش لفظ ۔۔۔۔ ۵

غزلیں ۔۔۔۔ ۲۳

سانیٹ ۔۔۔۔ ۷۱

نظمیں ۔۔۔۔ ۷۷

بکھرے بند ۔۔۔۔ ۱۰۱

دو دو شعر ۔۔۔۔ ۱۰۵

فردیات ۔۔۔۔ ۱۱۱

پیشِ لفظ

(پڑھیے نہ پڑھیے)

میرے اشعار کا ایک مجموعہ "فکرِ جمیل" کے نام سے ۱۹۴۴ء میں طبع ہو چکا ہے۔ وہ اشعار (غزلیں، نظمیں، سانیٹ وغیرہ) جو بوجوہ "فکرِ جمیل" میں شامل نہ ہو سکے یا بعد میں لکھے گئے اُن کا انتخاب موجودہ کتاب "بہکی باتیں" کے نام سے قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ نام غالباً اسی مجموعے کی پہلی غزل کے پہلے مصرعے سے ماخوذ ہے۔ لیکن انواعِ مطالب اور خیال و بیان کی آوارگی کے لحاظ سے بھی یہ نام اِس مجموعۂ اشعار اور اس کے "پیش لفظ" کے لئے چنداں غیر موزوں نہیں ہے۔

اس امر کا درست اندازہ کرنا کہ میں اس مجموعے میں شاعری کے مختلف اور پیچیدہ تقاضوں سے کسی حد تک عہدہ برآ ہو سکا ہوں یا نہیں قارئین کے ذوقِ سلیم کی ذمّہ داری ہے۔ لیکن یہ "پیش لفظ" مجھے موقع فراہم کرتا ہے کہ میں اُردو شاعری کے کچھ پہلوؤں کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کروں قطع نظر اس کے کہ یہ مجموعۂ کلام ان خیالات کا آئینہ دار ہے یا نہیں۔

شاعری اظہارِ معانی کے لئے ایک قسم کی لفظی صناعی معلوم ہوتی ہے۔ معانی کے دو واضح پہلو ہیں۔ اوّل خارجی مثلاً ماحول کی نقشہ نگاری۔ دوسرے داخلی یعنی جذباتی کیفیات کا بیان جس میں تخیلی اور فکری ترکیب بھی شامل ہیں۔ معانی کے یہ دونو پہلو شاعر کے خارجی ماحول، اس کے نفسیاتی ردّعمل اور اس کے زمانے کی ثقافت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان کا ذریعۂ اظہار بھی شاعر کے زمانے کی مروجہ زبان ہوتی ہے۔ یعنی ہر چیز کی طرح شعر کی اضافیت بھی وقت سے متعلق ہے۔

شعر خارجی حالات کی تصویر کشی میں جمالیاتی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے اور حالات کا انتخاب خود بھی ایک جمالیاتی قدر بن جاتا ہے۔ علاوہ ازیں شعر ایسی شعوری کیفیات کا مظہر ہوتا ہے جن میں جذباتی حقیقت کی تنویر حسنِ تخیل و تصوّر کو منوّر کرتی نظر آتی ہے۔ تمام شعری کیفیات قارئین کے دلوں پر جذباتی حقیقت کی صداقت کی وجہ سے اثر انداز ہوتی ہیں خواہ یہ حقیقت عیاں ہو یا طرزِ تخیل میں پنہاں ہو۔

حقیقت کیا ہے؟ سائنس بھی حقیقت کی جانب انسانی توجہ کی ایک صورت ہے۔ سائنس کا مقصد خارجی دنیا کی تشریح ہے۔ شعر احساسات و جذبات کی داخلی دنیا کے جمالیاتی اظہار کا نام ہے۔ شاعری واقعات کا نہیں بلکہ تاثراتِ حیات کا بیان ہے۔ شاعر اپنے تاثرات کو سامعین کے دلوں میں منتقل کرنے کے لئے تصویر کشی، معنی آفرینی، لفظی صناعی، تخییل، تمثیل، موسیقی، فکری ترکیب و ترتیب، غرض ترسیلِ جذبات کے سبب ذرائع استعمال کرتا ہے۔ ان ذرائع کا انتخاب اور استعمال شاعر کے فنّی شعور کے مطابق اور ماحول کے ثقافتی حالات اور ادبی روایات کے ماتحت ہوتا ہے۔ تجربۂ حیات اور تصوّراتی تجربہ کی صداقت کے ذریعے شاعر کا فن سامعین کے دلوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔

ایک غزل یا نظم کے اشعار کے اوزان و بحور، صوری و فکری اجزاء اور اشعار کی ترتیب، غرض مکمّل اثرِ فن، شاعر کے جذباتی تجربہ کی بنیادی کیفیات کو ظاہر کرتے ہیں۔ جب کہسار و مرغزار کا حسن شاعر کے دل میں دھڑکتا ہے۔ جب انسانی تعلقات

یا طنز تقدیر اس کے دل کو شعلہ زار بنا دیتے ہیں تو محض لغت ہی نہیں بلکہ شعروں کی موسیقی، استعاروں کی بندش، اور پیکرِ فن کا مجتمع حسن اس کے تجربۂ حیات کا اظہار بن جاتے ہیں۔ زبان کی لغت کے علاوہ بھی شعر کی ہر خصوصیت شاعر کے جذبات کے بیان کا لازمی حصہ ہوتی ہے جس کے بغیر بیان ناکافی اور ناقص رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لفظی معانی کو قائم رکھتے ہوئے اگر اشعار کو نثر میں تبدیل کر دیا جائے تو قارئین کے لئے اثر کا بہترین حصہ زائل ہو جاتا ہے۔ شعر کی ترتیب خود مطلبِ شعر کے بیان کی لابدی صورت ہے۔ اسی طرح جب بظاہر ایک ہی مطلب کا اظہار دو یا زیادہ شاعر کرتے معلوم ہوتے ہیں تو ان کے اشعار کے مطالب اور طرزِ بیان میں کم یا زیادہ اختلاف ضرور نمایاں ہو جاتا ہے۔ اور تاثر کا فرق ان کے نفسیاتی پس منظر کی انفرادیت کو واضح کرتا ہے۔

تاریخِ شاعری میں مطالبِ شعر زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتے نظر آتے ہیں۔ لیکن کیونکہ ماحول اور انسانی تعلقات اور نفسیاتی "ردِ عمل زندگی کے دائمی لوازم ہیں اس لئے ظاہری اختلافات کے باوجود تمام ثقافتوں کے مطالبِ اشعار میں ایک قسم کی ہم آہنگی بھی پائی جاتی ہے۔ فطرت کا مشاہدہ، موسموں کے تغیر، ماحول پر قابو پانے کی کشمکش، حیرت اور خوف، جنسی تعلقات، پیدائش اور موت اور تسلسلِ حیات، امید اور انتظار، جذباتی اور مجلسی مطابقت، جہد للبقا وغیرہ۔ یہ مضامین دنیا کی شاعری میں حالات کے مطابق مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ ضروریاتِ حیات نئے احساسات اور جذبات کو اجتماعی شعور اور نسلِ انسانی کے موروثی تحت الشعور سے منسلک کر کے شاعر کو مطالبِ شعر مہیا کرتی رہتی ہیں۔ انھی حالات کی بدولت اسطوری کردار، ہیرو اور دیگر اشارات و علامات دنیا کے ادب میں ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں اور انتقالِ مطالب کا ذریعہ بنتے ہیں۔ شاعر کے انفرادی شعور اور تحت الشعور کا قوم کے اجتماعی شعور اور تحت الشعور سے تعلق شعر کے مختلف پہلوؤں کو یعنی اوزان و بحور، قافیہ و ردیف، استعارہ و انتخابِ الفاظ کو شعر کی بنیادی اور لابدی ضروریات بنا دیتا ہے۔ یہ خیال کرنا کہ شعر کے جذباتی و تخیلی مطالب ان لوازمات کے بغیر نثر میں ادا ہو سکتے ہیں اور شعر کے فنی لوازمات

محض آرائش کے لئے ہیں فطرتِ شعر اور فطرتِ انسانی کے بنیادی تعلقات کو نظرانداز کرنے کے مترادف ہے۔ مختلف وقتوں کے ہیجان اور اُن وقتوں کے شعراء کے انفرادی رجحان روایاتِ ادب سے منسلک ہوکر مناسب مضامین کے انتخاب اور ان کے فنی اظہار کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شعر کو مکمل طور پر سمجھنے کے لئے شاعر کے دَور کو سمجھنا بھی مفید ہوتا ہے۔

یہ مسلّمہ ہے کہ شعر کا مواد اور اثر بہت حد تک تحت الشعوری ہوتا ہے۔ اگرچہ سائنس کی ترقی نے کچھ اذہان میں کئی تحت الشعوری کیفیات کو انسانی شعور سے قریباً منقطع کر دیا ہے مثلاً حیات بعد ممات، تصوف، یقین مافوق الفطرت، حاضر و غائب کا بیک وقت احساس اسطوری تصورات وغیرہ اور سائنس نے انسانی خیال کی حدود مادّے، مشاہدے اور تجربے تک متعین کر دی ہیں پھر بھی نسلی یادداشت اور تحت الشعور شعر میں ایسی کیفیات پیدا کرتے ہیں جو عام ادراک اور منطق کے ضبط سے بالاتر ہیں۔ شاعر دوسرے اذہان میں مماثل کیفیات پیدا کرنے کے لئے اس تحت الشعوری مواد اور مضطرب جذبات کو شعوری طور پر الفاظ کی مناسب ترتیب میں ادا کرتا ہے۔ شعر کا ہر پہلو اور ہر جز اس عمل کا لازمی حصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شاعر کو الفاظ کے انتخاب اور شعر کی ساخت کے متعلق عمیق فکر کی ضرورت ہوتی ہے۔

شعر کے موثر ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ عقل ایک حد تک محوِ خواب ہو جائے۔ اور احساسات اور جذبات کے پیام قبول کرنے والی صلاحیتیں منتظر بن جائیں۔ یہ ذہنی کیفیات الفاظ کو موسیقی کے دھاگے میں پرونے اور شعر کی صوتی تکرار سے حاصل ہوتی ہیں۔ قریباً ایسی ہی کیفیات تخلیقِ شعر سے تعلق رکھتی ہیں جب کہ رُوح شعور کا حصار توڑ کر تحت الشعور کے مضطرب دھندلکوں میں سرگرداں پھرتی ہے اور سکونِ قلب کی دشمن جذباتی الجھنوں کو حُسنِ فن کی تنویر میں عیاں کرتی ہے۔ شاید اسی لئے حضرتِ غالب فرماتے ہیں ؎

پھر دیکھئے اندازِ گل افشانئ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

یہ اس لئے کہ شراب نوشی سے عقل کا ضبط دماغ پر کمزور ہو جاتا ہے۔ اور ادراک

کے وہ پہلو جنھیں ہوش میں عقل محکوم رکھتی ہے ظاہر ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ افلاطون شاعری کو مقدس جنون کہتا ہے۔ اور مشرق میں شاعری جزولیست از پیغمبری سمجھی جاتی ہے۔ عروض لغت میں موسیقی کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ شاعر خود موسیقی کا ماہر ہو یا علم العروض کا فاضل ہو۔ شعر کی موسیقی شاعر کے ذہن کا انداز ہے جو جذباتی ہیجان اور جوش اظہار سے پیدا ہوتا ہے مختلف اور مضطرب جذبات کی آمیزش اور آویزش، موسیقی اور نیم مدہوشی، شعر کی تخلیق کے لئے مناسب فضا پیدا کر دیتے ہیں عظیم شعراء کے بہترین کلام کے مطالعہ سے یہ احساس ہوتا ہے کہ ترتیب الفاظ میں بیان و موسیقی یکجان و یک قالب ہو چکے ہیں۔ عروض، قافیہ و ردیف اور لغت کا صوتی حسن ذہن کو نیم مسحور کر کے شاعر کی جذباتی کیفیات کو سامعین کے دلوں میں منتقل کرنے میں ممد و معاون ہوتے ہیں۔ اور مجتمع طور پر اشعار کے مکمل معانی بن جاتے ہیں۔

اردو شاعری اور تنقید میں پچھلی نصف صدی کے دوران میں کچھ تغیر رونما ہوئے ہیں۔ برصغیر ہندو پاکستان کی پچھلی دو صدیوں کی تاریخ نے جس ثقافت سے ہمارا گہرا واسطہ پیدا کیا وہ عام طور پر یورپی اور خاص طور پر انگریزی کہی جا سکتی ہے۔ یورپ کی تنقیدی روایت میں محض شعریت کو شاعری کے مترادف خیال کیا جا سکتا ہے۔ یہ تنقیدی روایت یونان سے شروع ہوتی ہے۔ اکثر یورپی نقاد افلاطون کے مکالموں کو ان کی تخیلی خوبصورتی کی وجہ سے شاعری سمجھتے ہیں۔ ارسطو کے خیال کے مطابق ڈرامہ شاعری کی ایک صنف ہے۔ انگلستان کا شاعر اور نقاد سڈنی ⊗ "ورس" یعنی موزوں عبارت کو شاعری کی ضرورت خیال نہیں کرتا۔ انگریزی شاعر ⊖ ورڈز ورتھ بھی "میٹر" یعنی وزن کو شاعری کا محض زیور سمجھتا ہے۔ کلاسیکی یونانی اور کلاسیکی لاطینی شاعری میں قافیہ موجود نہیں ہے۔ نہ ہی قافیہ عبرانی سریانی یا سنسکرت شاعری میں پایا جاتا ہے۔ ژند اوستا کی شاعری مقفّٰی

⊗ Sir Philip Sidney (1554 – 1586)

⊖ William Words Worth (1770 – 1850)

نہیں ہے ۔ انگلستان اور شمالی یورپ کی قدیم شاعری میں قافیہ مفقود ہے ۔ یورپی نشاۃ ثانیہ کے بعد یونان اور روم کی قدیم شاعری کے احیا کے زیرِ اثر انگریزی شاعری کا معتد بہ حصہ ” بلینک ورس “ یعنی موزوں مگر بے قافیہ یعنی ” معرا “ شاعری کا ہے ۔ نیز امریکی شاعری کے اثر سے انگلستان کی جدید شاعری میں ایک حصہ آزاد نظم کا بھی ہے ۔ جس میں مطالب ایسے بے قافیہ مصرعوں میں ادا ہوتے ہیں جن کی لمبائی یا چھوٹا پن بالکل شاعر کی مرضی پر ہوتا ہے ۔ غرض انگریزی شاعری میں روایتاً بیان کو ہر قسم کی ترتیبی آزادی حاصل ہے ۔

فنّی اعتبار سے اردو شاعری عربی شاعری اور بعد از اسلام فارسی شاعری سے مطابقت رکھتی ہے ۔ بیسویں صدی کے آغاز تک ، غالباً پہلی عالمی جنگ تک ، مشرقی شاعری کی روایات بالکل واضح تھیں ۔

مطالب دو قسم کے ہو سکتے ہیں :-

(الف) علمی و منطقی

(ب) جذباتی و خیالی

اظہارِ مطالب کے دو واضح طریقے ہو سکتے ہیں :-

(ج) بلا وزن و بلا قافیہ

(د) موزوں و مقفّیٰ

جب جذباتی و خیالی مطالب (ب) موزوں و مقفّیٰ (د) عبارت میں بیان ہوتے تھے تو اردو میں ہم اسے شاعری تسلیم کرتے تھے ۔

جب جذباتی و خیالی مطالب (ب) بلا وزن اور بلا قافیہ (ج) عبارت میں لکھے جاتے تھے تو ہم اسے ایک قسم کی اِنشا سمجھتے تھے ۔ ایسی نثر کی بھی جو بے ترتیب اوزان و قوافی سے مرصّع ہو ہمارے کلاسیکی قصّوں میں کئی مثالیں موجود ہیں ۔ نثر کا دائرہ وسیع ہے ۔ رجزیہ اور مقفّیٰ نثر بھی ہو سکتی ہے مگر وہ شعر نہیں کہلا سکتی ۔ محض شعریت سے نثر شاعری نہیں بن سکتی ۔ جذباتی نثر میں ایک قسم کی موسیقی بھی پیدا ہو جاتی ہے ۔ مگر روایتی تنقید کے مطابق ہم اسے شاعری نہیں کہہ سکتے ۔ نیز استعارہ نثر میں بھی ادا ہو سکتا ہے ۔

مثلاً انگریزی ادب میں گلیور کا ہر سفر ایک طویل استعارہ ہے لیکن[1] گلیور کا سفر نامہ" انگریزی نثر کا شاہکار ہے۔

جب علمی و منطقی مطالب (الف) موزوں و مقفّیٰ عبارت (د) میں ادا ہوتے تھے تو اسے ایک قسم کی نظم سمجھا جاتا تھا۔ مثلاً منظوم تاریخ، منظوم جغرافیہ، منظوم طب وغیرہ۔ یہ ادب کی غیر شعری قسم شمار ہوتی تھی۔ تاریخِ ادب میں کوئی اس قسم کی اردو نظمیں لکھنے والا کبھی بحیثیت شاعر تسلیم نہیں کیا گیا۔

غرض اردو ادب میں شروع بیسویں صدی تک شاعری صرف جذباتی و تخییلی مطالب کے موزوں و مقفّیٰ عبارت میں ادا ہونے کا نام تھا۔ غیر موزوں ادبی کاوش کے لئے انشاء کا لفظ استعمال ہو سکتا تھا۔ ایسا ادب اردو میں شاعری نہیں کہلا سکتا تھا۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد کے تاریخی حالات کی وجہ سے جو تبدیلیاں برِّصغیر ہندوستان و پاکستان کی تعلیمی و معاشرتی روایات میں رونما ہوئیں ان کا اثر ہمارے ادب و تنقید میں ظاہر ہونا ناگزیر تھا۔ اس کا اندازہ خواجہ الطاف حسین حالیؔ پانی پتی کے "مقدمہ شعر و شاعری" سے ہو سکتا ہے۔ ذیل میں اس مقدمہ سے صرف دو اقتباس پیش کئے جاتے ہیں:-

(۱) " شعر کے لئے وزن ایک ایسی چیز ہے جیسے راگ کے لئے بول۔ جیسے راگ فی حدّ ذاتہ الفاظ کا محتاج نہیں اسی طرح نفسِ شعر وزن کا محتاج نہیں"

(۲) " الغرض وزن اور قافیہ جن پر ہماری موجودہ شاعری کا دارومدار ہے اور جن کے سوا اس میں کوئی خصوصیت ایسی نہیں پائی جاتی جس کے سبب سے شعر پر شعر کا اطلاق کیا جا سکے۔ یہ دونو شعر کی ماہیت سے خارج ہیں"

حالیؔ کے مقدمہ شعر و شاعری سے لئے ہوئے یہ دونو اقتباس ہمارے ادب میں آنے والے تغیّرات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ہماری ادبی روایات میں یہ تغیر ایک نئی ثقافتی

---

[1] JONATHAN SWIFT (1667-1754): GULLIVER'S TRAVELS

صبح کی تلاش میں ضروری سمجھے گئے۔ تنقید الملوک ہمارے لئے ملوک التنقید بن گئی۔ رومانی طرزِ خیال کے مطابق بے نظمی بھی ایک قسم کا نظم سمجھی جاتی ہے۔ آج کل اردو کے ہر ادبی مجلہ میں آزاد شاعری کی فراوانی اس امر کی مظہر ہے کہ امتدادِ روزگار سے ہمارے تنقیدی مسلمات تبدیل ہو چکے ہیں۔ اور اب "آزاد شاعری" بھی اردو ادب میں ایک صنفِ شاعری شمار ہوتی ہے۔ اگرچہ ہماری پرانی تنقیدی روایات کے مطابق "آزاد شاعری" محض اجتماعِ ضدین ہے۔

انگریزی آزاد شاعری انگریزی شاعری کے ارتقاء میں ایک قدرتی منزل معلوم ہوتی ہے۔ اُن کے یہاں اوائل سے بے قافیہ قدیم شاعری، بلینک ورس یعنی معرّا نظم اور مختلف الوزن مصرعوں والے "اوڈ" یعنی کلاسیکی گیت لکھے جاتے رہے ہیں۔ لیکن تاباں اور میر تقی میر سے حالی اور اقبال تک کی شاعری کے مطالعہ کے بعد اردو کی جدید آزاد شاعری ہماری شاعری کا لازمی اکلاتدم معلوم نہیں ہوتی۔ نیز باوجود اہم تغیرات کے ہماری زندگی میں کوئی ایسا بنیادی تفرقہ رونپذیر نہیں ہوا۔ (سوائے اس کے کہ مغرب کی نقل مجلسی وقار کی سند بن گئی ہے) کہ ہم جدید آزاد شاعری کی طرز اختیار کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

کئی حضرات کا خیال ہے کہ کیونکہ اس قسم کی عبارت انگریزی میں شاعری کہلاتی ہے اس لئے اردو میں بھی یہ شاعری ہے۔ بسند انگریزی شاعری۔ کئی حضرات جدید اردو شاعری کو صنعتی ماحول میں نئے تجربہ کے اظہار کی ضرورت خیال کرتے ہیں۔ لیکن ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے پاس صرف تین بڑے کارخانے تھے۔ آج کل ہم مشینی صنعت بالکل عمداً اور بالشعور یورپ کے عناصرِ قوت کے حصول اور معیارِ حیات کی رفعت کے لئے اختیار کر رہے ہیں۔ ان حالات کی بنا پر اپنے کلچر یعنی تہذیبی اقدار اور فنی روایات سے الجھنا کچھ غیر متعلق اور غیر ضروری اسلحہ اندازی معلوم ہوتی ہے۔ کسی زمانے میں اقبال کی شاعری ثقافتی افق پر نئے جذبات کے جلوؤں کا طلوع معلوم ہوتی تھی لیکن باوجود اس کے اقبال کی شاعری میں نحوی تراکیب کی شکست ظاہر نہیں ہوتی جیسے کہ جدید اردو شاعری میں ظاہر ہوتی ہے۔

علاوہ ازیں ہم اپنے آپ کو اتنا مغربی محسوس نہیں کرتے کہ مغرب کے اور ہمارے نفسیاتی حقائق اور ان کے اظہار کے اسالیب بالکل منطبق ہو جائیں۔ لیکن جیسن خود فریبی

رومانیت کا ایک پہلو ہے۔ اور آزاد شاعری کے نام سے ایک قسم کی جدید انشا ہمارے کچھ ادبی حلقوں میں مقبول ترین شاعری سمجھی جاتی ہے۔ اور موجودہ تنقید اسے جدید شاعری تسلیم کرتی ہے۔

اس پیش لفظ میں ان تنقیدی مسائل کے ذکر کرنے کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ میں نے "فکر جمیل" اور "بہکی باتیں" میں اپنے اردو ڈرامے "خونی انجام" کے مسودات سے نظم معرّا یعنی بے قافیہ نظم کے کچھ اقتباس شامل کئے ہیں۔ یہ ڈرامہ ۱۹۰۷ء میں چھپا تھا اس میں اکثر مکالمات نظم معرّا کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ نیز "بہکی باتیں" میں آزاد شاعری کا ایک نمونہ بھی شامل ہے۔ یہ سب انتخابات اس زمانے کے تنقیدی و ادبی پس منظر کی آئینہ داری کرتے ہیں جب کہ وہ لکھے گئے۔

یہاں ایک امر قابل ذکر ہے۔ وہ یہ کہ انگریزی عروض کی بنا اس "دباؤ" ⊗ پر ہے جو الفاظ کے کسی ایک رکن یعنی صوت پارے پر بولنے میں دیا جاتا ہے یا نہیں دیا جاتا۔ انگریزی بلینک ورس یعنی نظم معرّا کے ہر مصرعے میں دس صوت پارے ہوتے ہیں۔ جن میں پہلا رکن بے دباؤ اور دوسرا دباؤ والا ہوتا ہے۔ اسی طرح پانچ بار یکے بعد دیگرے بے دباؤ اور دباؤ والے رکن آئیں تو پانچ قدم کی یہ "لنگڑی" ⊖ بحر انگریزی عروض کے مطابق بلینک ورس کا ایک مصرعہ بناتی ہے۔ اس جگہ ان آزادیوں کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں جو انگریزی شاعروں نے اس بحر میں بھی برتی ہیں۔ مگر قابل ذکر یہ امر ہے کہ اردو لغت کے تلفظ میں انگریزی زبان کی طرح صوت پاروں پر دباؤ دینے یا نہ دینے کا بند و بست نہیں ہے۔ اردو میں اس قسم کی کوشش زبان کے لہجے کو اجنبی اور غیر مانوس بلکہ معیوب طرز بیان بنا دے گی اور زبان کے فطری ترنم کو خراب کر دے گی۔ اس لئے اُردو میں نظم معرّا محض بے قافیہ ہونے کے سوا انگریزی بلینک ورس کی تکنیک

⊗ ACCENT

⊖ IAMBIC / یونانی میں IAMB کے معنی "لنگڑا" کے ہیں۔ اس بحر کے پانچوں قدموں میں ہر قدم کے دو پاؤں پر وزن باری باری کم زیادہ لنگڑے کے پاؤں کی طرح ہے۔

کے دوسرے پہلو اختیار نہیں کر سکتی۔ نہ ہی اردو شاعری میں معرّا نظم کے لئے کوئی مخصوص بحر متعین کی جا سکتی ہے۔ ڈرامہ "خونی انجام" کے مکالموں میں نظم معرّا انہی حالات کے ماتحت استعمال ہوئی ہے۔ اردو نظمِ معرّا انگریزی بلینک ورس کی نقل کی کوشش کی ہے جو کامیابی کی حد تک نہیں پہنچ سکتی۔

اوزان و بحور ہماری شاعری اور تنقید میں شعر کی لازمی ضرورت تسلیم ہوتے رہے ہیں شعر میں غنائی عنصر اظہارِ جذبات کا مسلمہ ذریعہ ہے۔ وزن کے ساتھ قافیہ اور ردیف بھی جذبات کے مزامیر میں سے ہیں۔ لیکن کیونکہ قرونِ وسطیٰ میں تاریخی حالات کی وجہ سے قافیہ عربی اثر سے مغرب میں پہنچا تھا۔ اس لئے یورپی تہذیب کا ادبی میلان ہمیشہ قافیہ کی موافقت میں نہیں رہا۔

⊕ ایسکم اپنی کتاب "اسکول ماسٹر" میں قافیہ کو گوتھ لوگوں یعنی غیر مہذب یورپی اقوام کی نقل اور خنزیر کی خوراک خیال کرتا ہے۔

⊖ ٹامس کیمپین لکھتا ہے کہ مقفّےٰ نظم آسان قسم کی عامیانہ شاعری ہے جو عیسائی دنیا کے اکثر حصوں میں رواج پا گئی ہے۔ کیمپین کے خیال میں مقفّےٰ نظم لنگڑی اور بدنما قسم کی شاعری ہے۔ اس کا ایک نقص یہ ہے کہ شاعر قافیہ کی تلاش میں مطالبِ شاعری کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

لیکن انگلستان میں ہی مقفّےٰ شاعری کی خوبیوں نے اپنے مدّاح پیدا کئے۔ مندرجہ بالا اعتراضات کے جواب میں ⊕ سیموئیل ڈینیل لکھتا ہے کہ قافیہ موزوں شاعری میں حُسن کا اضافہ کرتا

⊕ ROGER ASCHAM (1515-1568) The Scholemaster

⊖ THOMAS CAMPION (1575-1620) the art of English POESIE

⊗ SAMUEL DANIEL (1562-1619) A Defence of RHYME

ہے۔ اس کے خیال میں عام آدمی بے قافیہ شاعری کے اوزان سے صرف منظم نثر کا لطف لیتے ہیں۔ مطالب شاعری کتنے ہی ارفع کیوں نہ ہوں جب تک وہ قافیہ کے ہم آہنگ ارکان سے منسلک نہ ہوں خوشگوار اور تسلی بخش معلوم نہیں ہوتے۔ سیموئیل ڈینیل کے نزدیک یہ غلط ہے کہ قافیہ اظہارِ خیال کے لئے رکاوٹ بنتا ہے بر خلاف اس کے لئے قافیہ شاعری کو پروازِ تخیل کے لئے پر عطا کرتا ہے۔ حسن کا حصول ہمیشہ محنت طلب ہوتا ہے۔ کیونکہ مقفّیٰ نظم کے لکھنے کے لئے ذکاوت اور مشقت کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے یہ صنف ہماری زبان (انگریزی) میں اعلےٰ اور قابلِ قدر نتائج پیدا کرتی ہے۔

ٹامس کیمپین نے قافیہ کی مخالفت کرتے ہوئے موزوں مگر بلا قافیہ یونانی اور لاطینی شاعری کے تتبع کی حمایت کی تھی۔ سیموئیل ڈینیل کے نزدیک یونانی اور لاطینی اشعار قافیہ کا ضبط نہ رکھتے ہوئے اندھا دھند آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ مطلب کی مکمل ادائیگی کے ساتھ مقفّیٰ شعر کی خوشگوار تکمیل ایسی خوبی ہے جسے بقول سیموئیل ڈینیل یونانی اور لاطینی شاعری حاصل نہ کر سکی۔ اس کے خیال میں ہمیں اپنی آراء کو محض (یورپی) قدما کی سند کا غلام نہیں بنا دینا چاہئے۔ جب تک کہ اس کے لئے معقول وجوہات نہ ہوں۔ محض یہ کہ دنیا کہ مقفّیٰ شاعری غیر مہذب طرزِ بیان ہے بالکل نامناسب ہے۔ مثلاً خود ہمارا علم اور تجربہ ہی ہمیں جھٹلائے گا اگر ہم یہ کہیں کہ کیونکہ چینی ہماری (انگریزی) طرزِ عروض میں شعر نہیں لکھتے اس لئے وہ غیر مہذب اور غیر متمدن قوم ہیں۔ البتہ اُن لوگوں کو جو قافیہ سے دلچسپی نہیں رکھتے پورا اختیار ہے کہ وہ یونانی اور لاطینی شاعری کی نقل میں لکھی ہوئی منظم نثر سے اپنا دل بہلاتے رہیں۔

ان مشرقی نقادوں اور ادیبوں کے لئے جو قافیہ سے بددلی کا اظہار کرتے ہیں۔ غالباً یہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ وہ انگریزی زبان میں مقفّیٰ شاعری کی فراوانی اور قافیہ کے حق میں مغرب کی تنقیدی روایت پر بھی توجہ رکھیں۔ قافیہ نے عربی کے ذریعے یورپ پہنچ کر یورپ کی بے قافیہ شاعری میں لطیف موسیقی کا اضافہ کیا ہے۔ جسے یورپی شاعر اور نقاد بھی تسلیم کرتے رہے ہیں جیسے کہ سیموئیل ڈینیل کی آراء کی مندرجہ بالا تلخیص سے ظاہر ہے۔

⊛ ڈرائیڈن جو انگریزی زبان کا مشہور ڈرامہ نویس، شاعر اور نقاد ہے ڈرامائی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ ٹریجیڈی یعنی المیہ ڈراموں کے مکالموں کے لئے نظمِ معرّا کی بجائے مقفّیٰ نظم فطرت کے مطابق اور زیادہ موثّر ذریعۂ بیان ہے۔ ڈرائیڈن کے خیال میں قافیہ اچھے شاعروں کے لئے مطلب ادا کرنے میں رکاوٹ نہیں بنتا۔ قافیہ کے مخالف اصل میں ناقص قافیہ بندی کے خلاف ہیں جس کی وجہ خود شاعر کی کمزوری ہوتی ہے کئی شاعر بلا قافیہ شاعری میں بھی ناقص شعر کہہ دیتے ہیں۔ اس کے خیال میں بلینک ورس یعنی نظمِ معرّا کو "منظوم نثر" بھی سمجھا جاتا ہے۔ وہ قافیہ کی شیرینی کا بھی ذکر کرتا ہے جسے مشرقی اقوام قدیم زمانے سے استعمال کرتی چلی آئی ہے۔ ڈرائیڈن مقفّیٰ شاعری کو اپنے وقت کی اعلیٰ ترین صنفِ شاعری خیال کرتا ہے۔ اس کی رائے میں قافیہ کا استعمال شاعر کے خیالات کی بیہودہ فراوانی کو ضبط میں لانے کے لئے بہت مفید اور ضروری ہے۔

غرض اسی طرح دوسرے نقادوں نے بھی خیالات ظاہر کئے ہیں۔⊗ آسکر وائلڈ قافیہ کے شیریں سحر کو سراہتا ہے۔⊖ چوسر سے لے کر آج تک مقفّیٰ نظم کی رنگینیاں انگریزی شاعری کو مزیّن کرتی رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ طرزِ شاعری انگریزی مذاق کے لئے بھی فنّی مسرت و تسکین کا باعث ثابت ہوئی ہے۔

تنقیدی نظریات کی تبدیلی کی وجہ سے قافیہ کے علاوہ وزن پر بھی نکتہ چینی کی گئی ہے جو فنّی جواز نہیں رکھتی۔ یہ نفسیاتی طور پر مسلّمہ ہے۔ کہ علمی، منطقی و اطلاعی مطالب کے لئے اور جذباتی مطالب کے لئے اسالیبِ بیان علیحدہ علیحدہ ہوں گے۔ نہ صرف طرزِ بیان بلکہ بولتے ہوئے انسانوں کے انداز اور ان کی حرکات بھی مختلف ہوں گی۔ کیونکہ وزن خود اظہارِ جذبات کا ذریعہ ہے اور جذباتی مطالب غنائی اظہار کے طالب ہوتے ہیں۔ لہذا جذبہ اور وزن کی

⊛ JOHN DRYDEN (1630-1700): ESSAY ON DRAMATICK POESY

⊗ OSCAR WILDE (1856-1900)

⊖ GEOFFREY CHAUCER (1340-1400)

مطابقت دنیا کے ادب میں شعر کی فنی اقدار میں سے ہے۔ اور دونوں کی ہم آہنگی تخلیقِ شعر کی بنیاد ہے۔

کئی انگریزی عروض کے شائق اردو شاعری کے ہموزن مصرعوں میں ایک بدمزہ یک رنگی و یک آہنگی دیکھتے ہیں۔ اور دورانِ نظم میں ؎

بحرِ رجز کو چھوڑ کے بحرِ رمل چلے

کی طرزِ شاعری کو بالکل درست اور جائز خیال کرتے ہیں۔ ذاتی مذاق پر نکتہ چینی مشکل ہے۔ لیکن اوّل تو مصرعوں میں ایک مضمون نہیں ہوتا اور جذبات کے تغیّر کی وجہ سے لفظی اور صوتی تغیر پیدا ہو جاتے ہیں۔ پھر اردو شاعری کا اکثر حصہ غزل کی صورت میں ہے۔ چند شعروں کے بعد دوسری غزل نئی بحر میں شروع ہو جاتی ہے اور قافیہ اور ردیف بھی بدل جاتے ہیں۔ نیز غزل کے ہر شعر میں نیا مضمون ہوتا ہے جس کی وجہ سے ہموزن اشعار میں بھی ایک قسم کے تنوّع کا احساس ہوتا ہے۔ غرض اردو غزل پر بدمزہ یک رنگی و یک آہنگی کا الزام نقلی تنقید کی مثال ہے جسے حقیقت کی درست جانچ غلط ثابت کرتی ہے۔

اس کے علاوہ مشرقی شاعری کے ہموزن مصرعوں کے اندر بھی صوتی حصص مختلف لمبائی کے ہوتے ہیں۔ یعنی اکثر مصرعوں میں معانی کے مطابق ایک محلِ انقطاع ہوتا ہے۔ جسے انگریزی میں "سیزورا"⊕ کہتے ہیں۔ اردو اشعار میں یہ مقام مصرعوں میں جگہ بدل کر "یک رنگی و یک آہنگی" کو بہت حد تک دور کر دیتا ہے۔ مثلاً ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں :-

مثلِ آئینہ ہے || اس رشکِ قمر کا پہلو
صاف ادھر سے نظر آتا ہے || ادھر کا پہلو (میر مستحسن خلیق)

تاب کم ظرف کو کہاں || تم نے
دشمنی کی || عدو سے چاہ نہ کی (مومن)

⊕ CAESURA

جس زمیں پر ہے || نقشِ پا تیرا
وہ زمیں || آسمان ہے گویا (ثاقب سیوہاروی)

بخت برگشتہ ہے || اچھی بھی بُری ہو جائے گی
دوستی جس سے کروں گا || دشمنی ہو جائے گی

(امیر اللہ تسلیم)

رونا یہ ہے کہ آپ بھی ہنستے ہیں || ورنہ یاں
طعنِ رقیب || دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا

(الطاف حسین حالی)

غرض "سیزورا" سے مصرعے منقسم ہونے سے آزاد شاعری کے کئی مبیّنہ فوائد ہماری کلاسیکی شاعری میں بھی نظر آتے ہیں۔

بعض حضرات جدید اردو شاعری کی علاماتی تحریک کو فرانسیسی علاماتی شاعری کے اثرات کا نتیجہ ظاہر کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں بادلیئر اور ملارمے کے نام اکثر مذکور ہوتے ہیں۔ بادلیئر اور ملارمے اپنے تاثرات کا اظہار خوبصورت موزوں و مقفّٰے عبارت میں کرتے ہیں لیکن ان فرانسیسی شاعروں سے متاثر جدید اردو شاعر ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی طرز کی آزاد عبارت لکھتے ہیں۔ غالباً اردو جدید شاعری فرانسیسی علاماتی شاعری سے ایسے ہی متاثر ہے۔ جیسے کہ جدید انگریزی شاعری ہے۔

علاوہ ازیں ہماری شاعری میں اشارات، کنایات، تلمیحات، علامات وغیرہ کی زبردست ادبی روایات موجود ہے۔ اور اکثر اشعار میں معانی کی دو بلکہ کئی سطحیں ہیں ممکن

⊗ CHARLES BAUDELAIRE (1821–1867)

⊖ STÉPHANE MALLARME (1842–1898)

ہے مغربی ادب میں یہ میلان مشرقی ادب کے مطالعے سے زور پکڑ گیا ہو۔ مگر دانتے کی "ڈیوائن کومیڈی" (انگریزی ترجمے کا نام) سے لے کر ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ تک مغرب کے ادب میں مشرقی ادب کے اثرات کا تاریخی تعاقب تفصیل طلب قصہ ہے۔ ہمارے یہاں گل و بلبل کے پامال مضمون پر اکثر اعتراض ہوتا ہے حالانکہ گل و بلبل مضامین نہیں بلکہ علامات ہیں جن کے مختلف شعروں میں سیکڑوں معانی ہیں۔ شراب، دَیر، چراغ، خنجر، ہوش، کوئے یار، زنجیر، ساقی۔ اسی طرح سیکڑوں الفاظ بدلتے ہوئے معانی سے ایوان شاعری کو رنگین ومنوّر کرتے نظر آتے ہیں۔ اور نئے الفاظ نئے جذباتی معانی کی علامات بنتے رہتے ہیں۔ کوئی شعر لے لیجئے۔ ناطق لکھنوی فرماتے ہیں۔

گرے تو ہیں لڑکھڑا کے لیکن اسی طرف رُخ کئے پڑے ہیں
ہے دل میں مستوں کے میکدے کا ابھی تلک احترام باقی

بادہ نوش کی ادائے مستانہ بیان کی ہے۔ لیکن علاوہ دیگر امکانات کے اس شعر کے مطالب سیاسی بھی ہو سکتے ہیں اور مذہبی بھی۔ کیا یہ میکدہ کعبتہ اللہ بھی ہو سکتا ہے۔؟ زیر زمین کروڑوں انسان "اسی طرف رُخ کئے پڑے ہیں"

غرض اگرچہ انگریزی اور فرانسیسی شاعری میں سمبولزم کی اقدار موجود ہیں مشرق نے یہ تموّل تمام تر مغربی ادب کے حوالے نہیں کر دیا۔ جو پھول آپ کے یہاں موجود ہیں ویسے ہی آپ بخوشی درآمد کر لیں۔ مگر اپنے گلزار پر بھی نگہ ڈالیں۔ اک ذرا آپ کو زحمت ہو گی۔

کسی ثقافت کا ادب محض بے مقصد حُسن آفرینی نہیں ہوتا۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی شاعری کیتھولک عیسائیت کی رُوح میں رچی ہوئی ہے۔ ادب اور مذہب کا تعلق ہر ثقافت میں بنیادی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مغربی شاعری کی نقل کرنے میں مشرق کا مذہبی شعور نفسیاتی الجھنیں پیدا کرے گا۔ لہٰذا جدید اردو شاعری میں اپنے مذہب سے بے تعلقی

⊗ SYMBOLISM

کا اظہار بالکل قابلِ فہم امر ہے۔ البتہ اب اردو شاعری میں اسلامی عقیدہ کی روایت کے خلاف مصلوب عیسےٰ کے حوالے اکثر نظر آتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دوسری زبانوں کے اعلیٰ ادب کا مطالعہ احساسات کی نشوونما اور ان کے تعین میں کافی ممد ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن معانی کی کچھ جھلکیاں، موسیقی کے کچھ انداز جو انگریزی ادب میں پائے جاتے ہیں وہ غالباً دوسری اقوام کے دائرۂ احساس سے باہر ہیں۔ یہی ہر قوم کی شاعری کے متعلق کہا جا سکتا ہے۔ جب بھی ایک ادب دوسری زبان کے ادب سے متاثر ہوا ہے وہ دوسری زبان کے ادب سے تکنیکی عناصر کی نقل جلد کر لیتا ہے۔ دوسرے ادب کی روحانی فضا کو حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ یہی کیفیت تھی جب لاطینیوں نے یونانیوں سے ڈرامہ سیکھا۔ لیکن ایسی کامیاب نقل کہ انگریزی شاعری کی تنقید کا اطلاق اردو شاعری پر بھی کیا جا سکے کچھ مشکل ہے۔ ممکن ہے کچھ اہلِ ذوق انگریزی جدید شاعری کے براہِ راست مطالعے کو اپنے مخصوص ادبی ذوق کی تسکین کا بہتر ذریعہ سمجھیں۔

اسالیبِ بیان کے علاوہ کئی دفعہ ایسے مطالب بھی ہمارے ادب میں مغرب کی نقل کے طور پر شامل ہو گئے ہیں جو ہماری پہلی ثقافتی روایات سے مختلف ہیں۔ نئے معانی کا اضافہ ادب میں تخیلی تموّل کا باعث ہوتا ہے۔ ہر اچھی اور نیک بات ہمیں اپنی کھوئی ہوئی چیز معلوم ہوتی ہے۔ اقبالؔ نے مغربی ادب اور فلسفہ سے مناسب مطالب منتخب کر کے انھیں اپنے فلسفۂ حیات میں سمو لیا ہے۔ اس طرح اقبالؔ نے مشرقی ثقافت و اقدار کی خدمت کی ہے۔ مگر نقل را عقل باید کے زرّیں مقولے کو نظر انداز کر کے ہمارے کچھ ادیبوں نے اپنے مذاق کے مطابق مغربی تصانیف میں سے ایسے اسالیب و خیالات مشرقی ادب میں منتقل کئے ہیں جو مغربی تہذیب میں اپنی جگہ پر ہیں۔ لیکن ہماری مجلسی و اخلاقی اقدار و روایات سے بنیادی مطابقت نہیں رکھتے۔ بلکہ مشرق کو ذہنی طور پر مغرب سمجھ لینے کی کوشش معلوم ہوتے ہیں۔ ایسے حالات میں تنقیدی بیداری ضروری ہے۔ کیونکہ گیا وقت واپس نہیں آتا۔ اور واقعات تاریخ کا جزو بن جاتے ہیں۔ ظاہر ہے۔ کہ ادب کے مناسب تجزیہ کے لئے محض فنّی تنقید کافی نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ثقافتی تنقید

بھی ادبی تنقید سے ہمعنان رہے۔ بشرطیکہ ثقافتی تنقید میں کوئی ذاتی یا معاندانہ پہلو نہ ہو اور صداقت کی بنا پر کی جائے نہ کہ کسی پروپاغندہ یا پارٹی بازی کی نیت سے۔

بیسویں صدی میں ہماری معاشرت، تعلیم اور طرزِ خیال میں جو تغیرات رونما ہوئے ہیں انھیں تاریخی حالات کے علاوہ سائنس کی ترقی سے بھی کچھ تعلق رہا ہے۔ نئی معلومات اور اختراعات نے ماحول میں حیرت انگیز تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں جن کا اقتصادی اور بین الاقوامی حالات پر گہرا اثر پڑا ہے۔ ذہنوں میں پہلے نظریے متزلزل ہو رہے ہیں۔ تغیرات کے سیلاب نے کئی جگہ انسانی روح میں ان مستقل کنا۔وں کو جو ہزاروں سال میں انسانی ضمیر و فلسفہ کے بنائے تھے دریا بُرد کر دیا ہے۔ موجودہ دور کی مضطرب فضاؤں میں ادب کے مسلّمہ مقاصد نے کئی دماغوں میں استفہامیہ صورت اختیار کر لی ہے۔ جب زندگی کا پس منظ فردوس اور راس کا حصول نہ رہا تو کئی ذہنوں میں جذباتی تجربہ نے ہی اقدار کی حیثیت لے لی جو تہذیبی لحاظ سے غیر تسلی بخش ہے۔ شکوک کی دھندلی فضا میں وقت کی طوفانی لہروں پر زندگی کی ناؤ سمت کے متعلق سوچ میں ہے اور جستجو کھو گئے ہیں۔

اِن حالات نے مغربی اقوام میں جو سائنس کی موجودہ ترقی کی براہِ راست ذمہ دار ہیں۔ اعصابی تشنج کی کیفیت پیدا کر دی ہے جس کا نتیجہ ثقافتی اور اخلاقی تنزل ہے جسے مغربی فلسفہ اور ادب تسلیم کرتے ہیں۔ مشرق سائنس کے ضروری حصول کے ساتھ ساتھ مغرب کے ثقافتی اور اخلاقی رویّوں کی غیر ضروری نقل سے اپنے احساسِ کمتری کو چھپا لینے کی کوشش میں ہے۔ ادب و تنقید پر ان حالات کا اثر پذیر ہونا لازمی تھا۔ ممکن ہے آئندہ کے کسی نقاد کے نقطہ نظر کے مطابق ہمارے موجودہ ادب و تنقید کے کچھ حصے بہکی باتیں ہی سمجھے جائیں۔

ہم انسانی تاریخ میں ایک تخیلی بحران سے گذر رہے ہیں۔ درست خود شناسی تکلیف دہ تجربہ ہے لیکن ہمیشہ قابل قدر ادب کا گہوارہ بنتی ہے۔ اخلاقی اور روحانی قوتوں کو انسان کی بڑھتی ہوئی مادّی قوتوں سے متناسب اور مطابق بنانے کی کوشش حسنِ حیات کے حصول کے لئے نہایت ضروری ہے۔ معلوم نہیں ہمارا ادب عصری ذمہ داریوں کو تسلیم کر رہا ہے یا نہیں۔ غالباً کچھ عرصہ گذرنے کے بعد اس کا درست اندازہ ممکن ہو گا۔

میں نے اس "پیشِ لفظ" کو بہانہ بنا کر شاعری سے متعلق جو متفرق خیالات اس وقت میرے ذہن میں آئے یہاں تحریر کر دیئے ہیں قطع نظر اس کے کہ اِن خیالات کا اس مجموعہ کے اشعار سے کوئی تعلق ہے یا نہیں۔ مضمون دراز ہے اور گنجائشِ بیان مختصر۔ اب "بہکی باتیں" اپنی جگہ قارئین کے سامنے ہے۔ مجھے صاحبِ ذوق احباب کے خیالات کا دِلی احترام ہمیشہ رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

جمیل واسطی

۱۵۵۔ کے، بلاک ۲
پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ ایس
خوشحال روڈ۔ کراچی ۲۹

غزلیں

جو میری باتیں ہیں بہکی بہکی تو رازِ تحت الشّعور کیا ہے
بیاں مرا کچھ بیاں نہیں ہے، بیانِ بین السّطور کیا ہے

جوانیاں سر پہ چھا رہی ہیں، بہار قرباں ہر قدم پر
نہیں اگر اُن کا حُسن صہبا تو میرے سر میں سرور کیا ہے

نہ توڑ ڈالوں طلسمِ صد تمکنت کو تیرے کہیں جنوں میں
نہیں اگر خواہشِ محبّت تو یہ ادائے غرور کیا ہے

زمانہ حاسد سہی محبّت کا، تجھ پہ ہی اعتبار ہوتا
بھلا تصوّر میں بھی یہ اخفائے راز تیرے حضور کیا ہے

بلند تہذیب کے نمونے ہیں یہ مزاروں کے بیل بوٹے
مگر فضا میں گرج ہے کیسی فغانِ زیرِ قبور کیا ہے

کراہتی آرزوئیں مدفونِ ضبط ہو کر جنوں بنی ہیں،
جو اذنِ اظہار سے یہ لاشے اُٹھیں تو یوم النّشور کیا ہے

مقدّس اعجاز سے ہے آراستہ جہانِ ورائے دانش
یہ گلشنِ آتشِ خلیل اور یہ برقِ بالائے طور کیا ہے

کنارِ مہتاب سے نگاہوں میں خوابِ زرّیں اتر رہے ہیں
فرازِ افلاک سے تعلّق ترا دلِ ناصبور کیا ہے

نہ مہرباں تم، نہ دوست دنیا، نہ نیک قسمت، نہ دل پہ قابو
جو واسطے کا قصور بھی ہو تو واسطے کا قصور کیا ہے

○

مانا کہ تم نے اُس پہ توجہ نہ دی - مگر
جو بات دِل میں تھی وہ بمشکل بیاں ہوئی

○

نغمہ حجابِ خامشی ، ہستی نقابِ مرگ
گردوں ہے کس فریب کو پنہاں کئے ہوئے

آ گئے تو ہم پہ لطف تمہارے کچھ اَور تھے
وہ آسماں تھا اَور، ستارے کچھ اَور تھے

قِسمت کی گو مِثال سیاہ بادلوں کی تھی
جو چاند کی طرف تھے کنارے کچھ اور تھے

کیا جانے تجھ کو غیر نے کیا کچھ پڑھا دیا
باتوں میں تیری آج اِشارے کچھ اور تھے

تیری خموشیوں میں حیا تھی، عتاب تھا
تیری تجلیّوں میں شرارے کچھ اور تھے

اک عمر سہ کے دردِ محبّت کی تلخیاں
دل کو تری طرف سے سہارے کچھ اور تھے

یاں بے بسی کا حال، وہاں بے رُخی کا رنگ
فردوسِ آرزو کے نظارے کچھ اور تھے

جورِ آفریں فلک، ہوا موجوں پہ پاش پاش
اے واسطیؔ جنوں کے وہ دھارے کچھ اور تھے

ہے اک فغانِ دردِ تمنّا کہیں جسے
سر پھوڑنا ہے، دل کا تقاضا کہیں جسے

تیرے بغیر صورتِ آسیب کوہسار
ڈستا ہے ناگ کی طرح دریا کہیں جسے

لغزیدہ پا ہے یوں روشِ وقت پر حیات
مسحورِ دلفریبیٔ فردا کہیں جسے

ہو حُسن بھی نہ حُسن کا اک پردۂ حسیں
لیلائے قیس محملِ لیلا کہیں جسے

گو ایک بزم میں ہیں پہ حائل ہے درمیاں
دوری دِلوں کی وسعتِ صحرا کہیں جسے

ہوتا ہے واسطی ترے اشعارِ تلخ میں
کیف جنوں کہ انجمن آرا کہیں جسے

ہم تجھے غیر کہیں گے ، ہمیں معلوم نہ تھا
جاں سے بیزار رہیں گے ، ہمیں معلوم نہ تھا

تیری غیرت کے لئے ہم نے زمانہ چھوڑا
ہم کہیں کے نہ رہیں گے ، ہمیں معلوم نہ تھا

عمر کٹ جائے گی رو رو کے یہ کہتے کہتے
اپنے دن اب تو پھریں گے ہمیں معلوم نہ تھا

مر کے مل جاتی ہے بسمل کو تڑپنے سے نجات
زندگی بھر نہ مریں گے ، ہمیں معلوم نہ تھا

یوں پہاڑ اُٹھیں گے اور سینے سے ٹکرائیں گے
آسماں سر پہ پھٹیں گے ، ہمیں معلوم نہ تھا

کوئی انساں کسی انساں سے محبّت نہ کرے
ہم ہر اک سے یہ کہیں گے ، ہمیں معلوم نہ تھا

واسطی اپنی محبّت کا فسانہ کہتے
اپنے آنسو نہ رکیں گے ، ہمیں معلوم نہ تھا

عدو نے دل سے گھڑی ہیں حکائیتیں کیا کیا
ہوئی ہیں حال پہ میرے عنائیتیں کیا کیا

قلم نے لوح پہ غیروں کی تہمتیں لکھ دیں
حضور پر بھی تو اتری ہیں آئیتیں کیا کیا

بجا ہے، شائبۂ طنز بدگمانی تھی
وگرنہ تم نے تو کی ہیں حمائیتیں کیا کیا

عیاں ہے جب سے کہ ہم سے ہے اجتناب تمہیں
اُڑی ہیں بزم میں رنگیں روائیتیں کیا کیا

مِٹے عدو کی رقابت، رہے نہ رسوائی
ہمارے خون کا حاصل ہیں عنائیتیں کیا کیا

وفا کی تاب نہ تھی، آستاں پہ جاں دیدی
تمہارے دل میں بھی ہونگی شکائتیں کیا کیا

اُٹھا کے واسطے فتنے عدو سمجھتے ہیں
کہ ہو رہی ہیں مسخّر ولائیتیں کیا کیا

نام لیتے تو ہیں، کیا کہئے کہ کیا کہتے ھیں
اُن کا احساں ہے کہ وہ مجھ کو بُرا کہتے ہیں

اُن کو مقبول اگر ہو تو مرا عشق ہے عشق
اور اگر آفتِ جاں ہو تو وفا کہتے ہیں

بے بسی کا ہے یہ عالم، تری الفت کی قسم
ہم سے جو کوئی کبھی کچھ کہدے "بجا" کہتے ہیں

تم ہی آتے ہو نظر باعثِ تخلیقِ حیات
کچھ سمجھ میں نہیں آتا تو خدا کہتے ہیں

وہ نگہ بدلی ہوئی ہے، یہ تغافل تو نہیں
ہم اسے اپنی نگاہوں کی خطا کہتے ہیں

رنگِ عصیاں سے چمن زار ہیں رومان کے خواب
نالۂ عشق کو صحرا کی صدا کہتے ہیں

ہم ہیں ناہگیرِ تلاطم ہیں، کہ اہلِ ساحل
دشمنِ جاں ہیں، ڈبونے کو روا کہتے ہیں

واسطی غیرتِ الفت ہے تو خاموش رہو
ہم فقیروں کو وہ راضی برضا کہتے ہیں

بدل گئے ترے تیور، چلی تھی بات ہیں بات
وگرنہ جانے حقیقت فقط خدا کی ذات

تڑپتے لوٹتے ڈستے ہیں سانپ سے دل میں
وہ بزمِ شب کے تبسّم کہ بن گئے شبہات

جو آبروئے محبّت لُٹی زمیں سہمی
کہا ستاروں نے ہیہات، چاند نے ہیہات

حریمِ ناز ہے برباد، بے سجود ہے دَیر
ہوس نے کر دیئے عُریاں نکاتِ حُسن و حیات

ورائے حُسن حسیں ہو، مگر میں سوچتا ہوں
کہ کیوں وفا میں مری آگئیں جنوں کی صفات

ہے عِشق حُسن فریب اور حُسن عِشق فریب
مِٹا جو حُسن و محبّت میں تھا وفا سے ثبات

حیات واسطے بے کیف تھی، غنیمت ہے
کہ پھر ہوا ہے حرم جلوہ گاہِ لات و منات

امتحاں مشکل ہے دل کا بے اثر تدبیر ہے
اِک طرف انسانیت ہے، اِک طرف تقدیر ہے
آدمی صیّاد ہے اور آدمی نخچیر ہے
زندگی . یہ زندگی، انسان کی تحقیر ہے
ہے مسلّم موت، پر اُمّیدِ ابدیّت کے ساتھ
زندگی ہے مضطرب اور موت بھی دلگیر ہے
دید سے تسکین دیدِ دلربا ہوتی نہیں
اُس کا حُسن دیدہ سوز اک پہلوئے تصویر ہے
اشرف المخلوق آئے ہیں محبت ساتھ ہے
ماہِ تاباں کے پہاڑ دل میں کھُبی جوئے شیر ہے
راہرو جو رہ نوردِ کوچۂ دلبر نہیں
اُس کی آزادی بھی آزادی نہیں زنجیر ہے
ہیں نگہ میں اس کے جلوے. گرچہ پابستہ ہیں، اور
سر پہ آویزاں ہمارے غیر کی شمشیر ہے
ہے دلِ انساں متن، قرطاسِ لرزاں زندگی
اور یہ تہذیب اس تحریر کی تفسیر ہے

1 6 MAR 1996

گیت ہیں ارض و سما میں، روح میں اک ساز ہے
زندگی نظمِ عناصر ہی نہیں، اعجاز ہے

ہے تصوّر گاہِ یزداں آدمِ خاکی کا دل
یعنی ذرّے کی ستاروں سے پرے پرواز ہے

تیری فرقت میں تڑپ کر کچھ یقیں آتا تو ہے
عشق اک تقدیر ہے تیری وفا اک راز ہے

وقت نے لیں سسکیاں، لرزی زمیں یہ دیکھ کر
آدمی خود تشنۂ تیرِ قضا انداز ہے

تیری الفت زندگی کی مے پہ مثلِ بوئے مے
تیرے آنے سے درِ میخانۂ دل باز ہے

دید ہے طوفانِ ناز — اور ہجر میں اے جانِ ناز
روحِ نازک پر تری بے نازیوں کا ناز ہے

ہیں ستاروں میں اشارے اور سایوں میں شگوں
موت میں ہے زندگی اور خامشی آواز ہے

جنونِ الفت میں ہوش کس کو ہے فکرِ سود و زیاں تصدّق
نگہ میں اک صورتِ حسیں ہے، زمیں تصدّق، زماں تصدّق

چھپے گی کیونکر محبّت اپنی نہیں ہے اشک و فغاں پہ قابو
شہادتِ دلبری پہ تقدیسِ درد و کربِ نہاں تصدق

وقار اور تمکنت تمہارے ہیں خوب اپنی جگہ پہ، لیکن
سنو جو ہیں زیرِ ضبط چیخیں کرو یہ سب پاسباں تصدق

جو حال پوچھو گے بے بسی کا، جو ہاتھ تھامو گے بے کسی کا
تو حُسنِ کردار پر تمہارے جمالِ کرّ و بیاں تصدّق

تمہارے عاشق نے روٹھ کر موت کی جبینِ سیہ کو چوما
جبینِ مرگِ سیہ پہ انوارِ طلعتِ دلبراں تصدّق

شکستہ کشتی نہ دیکھ اپنی، کنارے آگے کو بڑھ رہے ہیں
بنیں جو طوفان خود محافظ تو منّتِ بادباں تصدّق

خیال میں واسطی وہ کھِلتے ہیں گُل کہ جن کی بہار دضو پر
فریبِ باغِ جناں تصدّق، فروغِ حسنِ بیاں تصدق

یوں پرسشِ حالِ درد سے تو اے جانِ جہاں بیداد نہ کر
غم جَور کے کافی تھے مجھ کو، غم لطف کے اور ایجاد نہ کر

مت زحمتِ جَور اُٹھا، مجھ کو محرومئ قسمت کافی ہے
میں شاد نہیں ناشاد نہ ہو، تو شاد رہے ناشاد نہ کر

لب سے نہ حقیقت کہنے دے، اغیار کی باتیں سہنے دے
پر بزم میں اپنی رہنے دے، بیداد تو کر برباد نہ کر

وہ دیکھ ترے پیچھے کیا ہے، پاؤں کو سنبھال اور ہوش سے چل
تقدیر سے تو آزاد نہیں، پابند ہمیں صیّاد نہ کر

اُمّیدِ وفا پر الفت کی، الفت نہ تھی یہ مزدوری تھی
تیشے کی زبانِ خونیں سے شیریں کا گلہ فرہاد نہ کر

اے واسطی کیوں انگر ہے قلم، کاغذ سے دھواں سا اٹھتا ہے
بس بھول بھی جا اُس ظالم کو، وہ بھول گیا تو یاد نہ کر

جو میزانِ وفا میں اک طرف تو نے "نہیں" رکھدی
جنوں نے دوسری جانب مری جانِ حزیں رکھدی

کسی کی بے نیازی سے نہ بدلی دل کی مجبوری
اٹھائی تھی جہاں سے پھر وہیں اپنی جبیں رکھدی

جنوں پرور سہی یہ دل مگر ایسا غضب کیوں ہو
ترے تصویر بھولے سے سرِ عرشِ بریں رکھدی

پڑی تھی آشیاں کی خاک لیکن بے کسی نے پھر
اکٹھے کر کے کچھ تنکے بنائے نو وہیں رکھدی

لئے پھرتے رہے لاشے کو بالائے زمیں لیکن
جو حسرت زندگی کی تھی کہیں زیرِ زمیں رکھدی

ممکن ہے ہماری غلطی ہو اور عقل ہو ان دیوانوں میں
اسرارِ حقیقت کہتے ہیں، کہتے ہیں مگر افسانوں میں

اپنوں نے تو مارے پتھر پر جس نے کبھی بدلہ لے ہی لیا
زخموں سے گرا جو خونِ وفا وہ بانٹ دیا بیگانوں میں

دل کاٹ کے رکھ دیا پاؤں پہ، گو پتھر کی تھی دیوی، جھوم گئی
حیرت سے برہمن کانپ اٹھا، نغموں کی صدا تھی کانوں میں

خاموش رہے پر دکھ میں کٹی، دنیا کو وفا کی جانچ نہ تھی
کچھ دل کی چبھن کو چین ملا جب لیٹ گئے ویرانوں میں

جب عشق نے موت کو للکارا مائل بہ سجود ہوئی فطرت
کہتے تھے ملائک بھی کہ عجب اسرار ہیں ان انسانوں میں

گو حسرتیں بن تو گئے ارماں پہ واسطی چین نہ دل کو ملا
شعلے لپک اٹھتے ہیں اب بھی، کچھ جان تھی ان ہیجانوں میں

○

انجان وہ بننے پہ غضب ڈھا گئیں آنکھیں
پہچان گئیں، دیکھ کے شرما گئیں آنکھیں

فطرت کے تقاضوں پہ ہے بیہود تحیّر
آئینے میں خود اپنے پہ اِترا گئیں آنکھیں

نشتر تری باتوں کے لگے سینے پہ، لیکن
اک غمزۂ صد ناز سے بہلا گئیں آنکھیں

گِرتے ہیں مری منتظر آنکھوں سے ابھی اشک
تب آئیں گے جب موت میں پتھرا گئیں آنکھیں

اب ضبطِ نگہ رکھنے کی تھی تاب نہ دل کو
گھبرا گئیں جب راز مرا پا گئیں آنکھیں

○

آئیں نہ یاد بن کے دلِ داغدار میں
جل جائیں پاؤں اُن کے نہ اِس لالہ زار میں

پاشیدہ سر ہیں غنچے کسی انتظار میں
گویا مئے جنون ہے جامِ بہار میں

برباد صبہ ہوش ہیں ، بیتاب کائنات
کچھ کچھ ادائے رقص ہے پائے نگار میں

ڈر ہے نہ لوگ واسطے پالیں نشانِ یار
ترتیب سی عیاں ہے ترے اِنتشار میں

○

تصوّر کی کرشمہ سازئے فردوس کیا کہیئے
مگر ایسی کہاں تجھ سے مجھے بے اِعتنا کر دے

فردوسِ بہائے رنگیں نذرِ بہارِ صحرا
کیفِ سرودِ انجم زیبِ نگارِ صحرا

نظّارۂ شفق ہے یا بادۂ پریشاں
ہے خونِ چشمِ وحشت یا گلعذارِ صحرا

مجبور ہے محبّت شہروں کی محفلوں میں
اے آہ کیفِ عشقِ بے اختیارِ صحرا

ہے نغمۂ ملائک بیتاب ہر شجر میں
جنت میں سو رہی ہے گورِ کنارِ صحرا

رقصِ موجِ برق یا اک شعلۂ دیوانہ ہے
شمعِ حسنِ روئے دلبر خوابِ صد پروانہ ہے

آس ہے دل میں، کس سے؟ کیسی؟ بات کہی نہ جائے
کھیت میں جیسے الھڑ لڑکی ہنس ہنس کے شرمائے

تارے ٹم ٹم کریں اشارے، چاند ہمیں بہکائے
بلبل گائے، پھول اترائے، یاد کسی کی آئے

جانیں بھی پر مانیں کیسے؟ اوٹ سے جھانکے جائیں
پیار کی باتیں آنکھوں آنکھوں دل کو دل سمجھائے

میں جاؤں تو کوئی نہ پوچھے، سونی گلیاں، پھاٹک بند
تو آئے تو تارے ٹوٹیں، چاند اُتر کر آئے

واسطی اپنی گذری یونہی، شکر ہے یونہی گذر گئی
لب پہ ہنسی مذاح کی باتیں، سینے میں اک "ہائے"

خاموش لب تھے ، موت میں ساکت زباں ہوئی
اے آہ کس طرح مری الفت بیاں ہوئی

میرے جنوں کا رازِ خفی جو بات ، بزم میں
وہ تیرے التفاتِ جفا سے عیاں ہوئی

صحرا میں چاندنی مری تربت پہ سوگئی
تنہائی جاگتی رہی اور راز داں ہوئی

تم نے مٹا کے ، غیر کی دلداریاں تو کیں
اچھا ہوا کہ گور مری بے نشاں ہوئی

آنکھوں میں خوں بنی تو محبت ہے واسطے
دل سے لبوں پہ آئی تو اک داستاں ہوئی

وہ سازشیں کونوں گوشوں میں، خاموش اشارے زینوں میں
چالاک نگاہیں پہلو سے، مغرور وقار جبینوں میں

سنتے ہیں خزانوں کے اوپر اک کالا ناگ کبھی ہوتا ہے
یاں اوپر خالص سونا ہے۔ زہریلے ناگ دفینوں میں

رنگینیٔ محفل ہے اِس میں، وہ تیر لگا، معصُوم گرا
احباب ہیں رونقِ محفل یا بیٹھے ہیں غنیم کمینوں میں

غیبت میں صداقت کی خدمت وہ ہر دم کرتے رہتے ہیں
کہتے ہیں ہمیشہ بات کھری، کچھ بغض نہیں ہے سینوں میں

ہے واسطی اپنی خوش بختی، محُسن ہیں ہمارے وہ جن کے
اِحسان نہوں تو اِحساں ہیں، ہوتے ہیں جو رقت رہینوں میں

○

مجھے قرار نہیں ، بیقرار رہنے دے
امید رہنے دے، کچھ انتظار رہنے دے

بدل نہ جائے ، زمانے پہ اعتبار نہ کر ،
جفا کے پردے میں تھوڑا سا پیار رہنے دے

جو تو نگاہ میں آئے تو پھول کھلتے ہیں ،
بہارِ بیت نہ جائے ، بہار رہنے دے

بوقتِ قتل مجھے خونبہا تو مل جائے
نگاہ اپنی ذرا شرمسار رہنے دے

نئی جفا نہ ہو ظالم کی یہ خود آرائی
خدایا دِل پہ مجھے اختیار رہنے دے

غلط سہی تری زلفوں کی یوں پریشانی
غلط ہی رہنے دے ، غفلت شعار ، رہنے دے

بتوں سے واسطی امیدِ التفات نہ رکھ
خود اپنے حسن کا اُن کو خمار رہنے دے

64918

نہ میں تیری بزم میں جا سکا ، نہ میں پاس تجھ کو بلا سکا
نہ سُنا سکا تجھے حالِ دل ، نہ میں اپنے دل کو منا سکا

یونہی دن گیا ، یونہی شب گئی ، کبھی ہنس دیئے کبھی رو دیئے
مرے دل میں پھانس گڑی رہی ، تجھے بھول کر نہ بھلا سکا

نہ حجابِ ضبط و جنوں کہیں مرے دردِ دل کو عیاں کرے
مری لاؤ بالی سی طرز تھی ، کوئی میرا راز نہ پا سکا

رہا بارِ دل مرا دردِ دل، کوئی رازداں تھا نہ چارہ گر
تجھے رازداں تو بنا لیا ، تجھے چارہ گر نہ بنا سکا

رُخِ ماہ پر مری ارضِ خاک بھی مثلِ ماہ ہے ضوفشاں
یہ بتا کہ کیا مرا سوزِ دل ترے دل میں سوز جگا سکا

نہ کبھی کرم نے سکوں دیا ، یونہی بے کلی میں گذر گئی
وہ جو اشک آئے بھی آنکھ میں ترے سامنے نہ گرا سکا

اسے اپنے ہاتھ سے ذبح کر کے دبا دیا کہیں واسطی
وہی دل کہ جاں کا عذاب تھا ترے غم تاب نہ لا سکا

ہمت نہ ہوئی مایوسی میں پر تم جو بلاتے آجاتے
تاریک تھی شب رہ پا نہ سکے، تم راہ بتاتے آجاتے

دل ٹوٹ کے بکھرا خاک پہ، ہم دیکھا کیۓ دل کے ٹکڑوں کو
تم یاد جو کرتے بھول کے بھی، ٹکڑوں کو اٹھاتے آجاتے

دن رات کسک تھی سینے میں، راحت نہ رہی تھی جینے میں
امید نے کبھی دھوکا نہ دیا، دھوکے میں جو آتے آجاتے

مانا تمہیں ملنا مشکل ہے، تقدیر بنی ہے دیواریں
تم ایک اشارہ کر دیتے، ہم جان سے جاتے آجاتے

ہے واثقی اُن کو شکوہ کیوں؟ خود آجاتے کچھ روک نہ تھی
ہم پاؤں ہتھیلی پر لیتے، آنکھوں کو بچھاتے، آجاتے

زباں ہل نہ سکی ، حالِ دل سُنا نہ سکے
جو دل پہ بیت گئی ہم انھیں بتا نہ سکے

نگاہ دیکھ سکی ، کچھ بیان کر نہ سکی
وہ آئے آنے کو دل کی لگی بجھا نہ سکے

بہار آئی مگر آہ گلفشاں نہ ہوئی
وہ مسکرانے کو تھے اور مسکرا نہ سکے

وہ اُٹھ کے چل دیئے ، ہم اشک تھامتے ہی رہے
گلے پہ رکھ لیا خنجر ، گلے لگا نہ سکے

عجیب واسطہ اعجازِ دلبری ہے کہ وہ
ہزار جور کئے پر ہمیں ستا نہ سکے

○

کیا ہے خاک جو دل کو ، جگر لہو کر دو
تم آج اپنی محبّت کو سُرخرو کر دو

کہو کسی سے کہ آ جائے کوئی کیا کیجے
دنا کو بزم میں بے ننگ و آبرو کر دو

نظر نہ آؤ تو پھر زندگی ہے تاریکی
کسی کی عمر اندھیرے میں جستجو کر دو

تم اپنے حُسن کے انداز سے اگر چاہو
جہاں میں حشر کے انداز ہو بہو کر دو

○

ہو بہو میری فسردہ زندگی کی ہے مِثال
ایک پتّہ شاخ پر ہلتا ہے مُرجھایا ہوا

احباب کی جفا میں تمہیں ڈھونڈھتے رہے
ہر جورِ دلربا میں تمہیں ڈھونڈھتے رہے

منزل وہ بے خودی کی محبّت میں آگئی
ہم جلوۂ خدا میں تمہیں ڈھونڈھتے رہے

مایوس دل کو ایسے ہی تسکیں سی ہوگئی
خود اپنی ہی دفا میں تمہیں ڈھونڈھتے رہے

یوں واسطہ خدا سے بھی الفت میں پڑگیا
سجدوں میں اور دعا میں تمہیں ڈھونڈھتے رہے

گرا ہے اشک کوئی تارِ سازِ جذبہ پر
ہے شعر نغمہ سا اک نالہ تیری فرقت کا

خاموش ہیں ، تیور پہ حیا چھائی ہوئی ہے
اور چشمِ فسوں ساز بھی شرمائی ہوئی ہے

ظاہر نہیں انکار میں وہ پہلی سی وہ تلخی
اور ناز سے گفتار بھی اِترائی ہوئی ہے

لغزش میں صبا کی کچھ انداز نیا اور
شاید ترے کوچے سے بھی ہو آئی ہوئی ہے

آئی ہے بہار اور جنوں اور فزوں ہے
آخر کسی مقصد سے خود آرائی ہوئی ہے

کچھ واسطی ہے سیرتِ دلدار میں نیکی
کچھ نقشِ کفِ پا پہ جبہہ سائی ہوئی ہے

○

جہاں میں صورت و سیرت کی گفتگو کیا ہے
جو گل ہو سامنے پہچانتے ہیں بُو کیا ہے

میں دیکھ کر تری صورت کو دل میں سوچتا ہوں
کہ عشق کیا ہے، خدا کیا ہے، اور تو کیا ہے

جو حُسنِ خاک ہے یہ حُسن حُسن کیا شے ہے
وہ مے، یہ جس کی ہے دُردِ تہِ سبو، کیا ہے

ورائے حُسن اگر دل کی آنکھ دیکھتی ہے
ورائے حُسن ہے کیا، دِلکی جستجو کیا ہے

زمیں پہ نقش حقیقی نہیں تو پھر تیرا
فلک کے پار وہ امکانِ ہو بہو کیا ہے

تحیّرات میں گم ہیں تعیناتِ حسیں
یہ کیا کہوں کہ مرے دل کی آرزو کیا ہے

اُترتے ہیں مہ و خورشید اس کی لہروں پر
وگرنہ بحر سیہ رو کی آبرو کیا ہے

جہاں سے واسطی امید چشم پوشی کی
اُٹھا کے آنکھ نگہ کر کہ چار سو کیا ہے

بہار شعلہ بداماں ہوئی ہوئی نہ ہوئی
فضائے درد چراغاں ہوئی ہوئی نہ ہوئی

ہزار زخم بھی کھائے. تڑپ کے جان بھی دی
کسی کی آنکھ پشیماں ہوئی ہوئی نہ ہوئی

ہمیں تو موت میں تسکیں رضائے یار کی تھی
انھیں بھی قدرِ شہیداں ہوئی ہوئی نہ ہوئی

وفائے جانِ تمنّا کی جب نہ آس رہی
وفائے عمرِ گریزاں ہوئی ہوئی نہ ہوئی

لپٹ کے چاندنی روئی، فضا نے پیار کیا
لحد پہ شمع فروزاں ہوئی ہوئی نہ ہوئی

جبینِ شب پہ درخشاں تھے اشک، کیا معلوم
سحر کے ماتھے پہ افشاں ہوئی ہوئی نہ ہوئی

جو کوئی آس نہ ہو واسطی تو جاناں سے
بیاں شکایتِ جاناں ہوئی ہوئی نہ ہوئی

○

تمام عمر محبّت میں رائگاں گذری،
بہار گذری ہے یوں جس طرح خزاں گذری

حجاب بیچ میں تھے جن کو ہم مٹا نہ سکے
وفا کا پاس تھا انگشت بر دہاں گذری

بھڑک اُٹھے ہیں تصوّر کی راہ پر شُعلے
کہ یاد جب کبھی گذری شرر فشاں گذری

وہ اک نگاہ! کہ احساسِ حُسن و عشق بنی
وہ اک گھڑی! کہ محبت کی راز داں گذری

دراز کردۂ فرقت تھی عمر، گذری تو
وہ دن پہاڑ سا گذرا شبِ گراں گذری

سنی ہے موت کے قدموں کی چاپ رونق میں
صدائے نوحہ بھی نغموں کے درمیاں گذری

چھُپے ہوئے ہیں بہت زیرِ خاک جن کی عمر
خیالِ حُسن میں بالائے آسماں گذری

کسی کی واسطی بیدردیوں کا احساں ہے
کہ جاں گئی تو یہ سمجھے بلائے جاں گذری

○

دیکھا تو محبّت میں آنکھوں سے بہے دھارے
تم مانو نہ مانو پر تم جان سے ہو پیارے

آنکھوں میں فضائیں ہیں اور لب ہیں جنوں افزا
دامن میں بہاریں ہیں، ماتھے پہ ترے تارے

کل جھیل کے پانی پر اک ہنس کا جوڑا تھا
تھی شام ذرا گہری اور لہریں تھیں مہ پارے

○

تصویرِ محبت تھا ہنسوں کا حسیں جوڑا
اس دنیا میں ہیں وہ بھی جو بخت کے ہیں مارے

ہاں حسن تو دائم ہے دائم ہی کرو گے جور!
پھر جور کا کیا ہوگا جب مٹ گئے بے چارے

اُس بزم کی کیا کہیے، کیا ہم پہ عنایت تھی
سینے پہ چلے خنجر اور سر پہ چلے آرے

اے واسطی محفل کو اب کہہ دو خدا حافظ
جو بیت گئی بیتی، وہ جیتے ہیں ہم ہارے

اُس کا انداز تھا کچھ ایسا بلا کا انداز
تھا وہ اندازِ قیامت کہ قضا کا انداز

چمنستانِ تصوّر میں بہاریں آئیں
سحرِ فطرت ہے ترے ناز و ادا کا انداز

نیم مستور ہے محشر، یہ عیاں کرتے ہیں
نیم عریانئ رُخ اور ردا کا انداز

حُسن جِن آنکھوں سے دیکھا وہی خوں روئی ہیں
یوں ہوا ہم پہ عیاں لطفِ خدا کا انداز

جان دی اپنی خوشی سے، نہ تھا کچھ راز اِس میں
ہم نے پہچان لیا تیری وفا کا انداز

آنے والے کسی طوفان سے پہلے کا سکوت
بزمِ بیداد میں خاموش فضا کا انداز

واسطی اپنی محبت پہ ہنسی آتی ہے
بے بسی میں لیا مظلوم گدا کا انداز

بزم میں تمہاری ہوں، غیر کی قسم تنہا
وہ کرم کرم کیسا جو نہ ہو کرم تنہا

دل کا دُکھ نہ پا جائیں، دوست یہ سمجھتے ہیں
بزم میں نشاطِ دل، صحبتِ الم تنہا

زندگی کی راہوں پر اکثر ایسے وقت آئے
اشکبار آنکھیں تھیں اور اُٹھے قدم تنہا

مت بلاؤ غیروں کو، عزّتِ جنوں رکھ لو
مجرمِ محبّت پر تم کرو ستم تنہا

جو بھی ہوں تمہارا ہوں، آبرو ہے نسبت میں
جام تو ہزاروں ہیں پر ہے جامِ جم تنہا

بزم میں کہوں کیسے کیوں ہوا ہوں دیوانہ
رازِ دل بتا دوں گا جب ملیں گے ہم تنہا

رشک سے جہاں میں ہم واسطی اکیلے تھے
گور میں قیامت تک سہہ رہے ہیں غم تنہا

گو حسین ہے صنم ، خدا ہے کوئی
دل کہے ، عقل نے کہا ہے کوئی

زندگی کے کسی دوراہے پر
جانے کب سے کھڑا ہوا ہے کوئی

ظلم کی آرزو نہ پوری ہو
ظلم ایسا کہیں روا ہے کوئی

یہ بگولے ہیں یا کہ بن کر خاک
آج صحرا میں گھومتا ہے کوئی

جوشِ طوفاں ہے کیسا کیف انگیز
خوف میں خفیہ دلربا ہے کوئی

دل دھڑکتا تھا چاپ سُن سُن کر
میرے سرہانے رُک گیا ہے کوئی

واسطی گو ربھی ہے طرزِ بیاں
ایک خاموش ماجرا ہے کوئی

بربادی سامنے آنکھوں کے دیوار یہ گو مرقوم بھی ہے
جو ہو کے رہے گا ہونے دو، اس بنتِ وفا مقسوم بھی ہے

انجان نہیں انجان بھی ہیں، اندازِ تغافل کیا کہیے
گویا کہ مرے دل کی حالت معلوم نہیں معلوم بھی ہے

تہذیب ہزاروں سال کی ہے، فطرت پہ مگر کچھ ضبط نہیں
تنہائی خود اک دیوانگی ہے جو مجلس میں معدوم بھی ہے

امّید اور نا امّیدی سے یکدم ہے تعلّق وعدوں کا
یوں اُن کے کرم سے دل میرا محرم نہیں محروم بھی ہے

کیا کیا نہ کیا مجھ سے دل نے، کیا کیا نہ ہُوا اِس دل سے بھی
مجبور رہوں اپنے دل سے میں جو ظالم ہے مظلوم بھی ہے

ہم نے سجدے تو کئے وا کوئی در ہو کہ نہ ہو
ہم تڑپتے ہی رہے ان کو خبر ہو کہ نہ ہو

ایسے معلوم ہوا چاند اُتر آیا ہے
واقفِ کیفِ نظر رشکِ قمر ہو کہ نہ ہو

اُن کے انکار پہ اک آہ تھی پھر خاموشی
اب وہ گفتار بہ اندازِ دگر ہو کہ نہ ہو

روز و شب، شام و سحر، ایک ہی تاریکی ہے
روز و شب ہو کہ نہ ہو۔ شام و سحر ہو کہ نہ ہو

اشک ریزی سے مرے درد کو تسکین تو ہے
دادرس کوئی ترا دیدۂ تر ہو کہ نہ ہو

ظلم ہی ظلم نظر آئے۔ نگہ خوں ہو جائے
پھر تصوّر میں جہاں زیر و زبر ہو کہ نہ ہو

ہم ہیں آوارہ اسی دنیا میں جنّت کے لئے
خونفشاں دل کے سِوا رختِ سفر ہو کہ نہ ہو

لاش اُس در پہ گرے گی یہ جہاں دیکھے گا
زخم سینے پہ ہوں اور شانوں پہ سر ہو کہ نہ ہو

پاس سے گذر وا بھی واسطی کچھ ہوش میں ہے
کل وہ مایوس سرِ راہ گذر ہو کہ نہ ہو

شعلہ رو تھے مگر اشتعال یوں تو نہ تھا
جفا کی خو تھی، جفا میں جلال یوں تو نہ تھا

خطا ہماری تھی یا ایک ساغرِ مے کی
فروغِ جلوۂ جوشِ جمال یوں تو نہ تھا

نگاہِ ناز تھی مخمور اور نشتر زن
جگر پہ غمزۂ چشمِ غزال یوں تو نہ تھا

تمہارے آنے سے دنیا میں انقلاب آیا
وگرنہ پہلے محبّت کا حال یوں تو نہ تھا

تڑپ کے درد سے کہتے ہیں "آئیگی کب موت؟"
لبوں پہ آہ تھی آگے سوال یوں تو نہ تھا

ستاؤ اتنا کہ ہو جائے دُکھ سے دیوانہ
کسی حسین کو میرا خیال یوں تو نہ تھا

جفا کے واسطے عادی تھے ہم مگر اُن کی
نگہ بدلنے کا دل پر ملال یوں تو نہ تھا

○

تم یاد تو آؤ گے یہ ہم نام نہ لیں گے
مجرم تو رہیں گے مگر الزام نہ لیں گے

رسوائی نہ ہو گی ، نہ تمہاری نہ ہماری
ہم اشک سے، اور آہ سے کچھ کام نہ لیں گے

مائل بہ تلطف بھی ہو گر ساقئ تقدیر
اور تشنگی تڑپائے، یہ ہم جام نہ لیں گے

دیوانے بھی درویش بھی ناداں بھی بنیں گے
ہم تہمتِ بد بختئ ایام نہ لیں گے

اب جور بھی بے سود ہیں الطاف بھی بے سود
دل دیدیا ، بیچا تو نہیں ، دام نہ لیں گے

ہے زندگی جب واسطی ناگن سی سیہ رات
احسانِ سرِ زلفِ سیہ فام نہ لیں گے

یاد آئیں گے آنسو مرے ، یاد آئیں گی آہیں
ڈھونڈے گی سدا تیری نگاہ میری نگاہیں

کانٹے چبھے تلووں میں تو نکلا ہے لہو بھی
گلزار بنا دی ہیں درِ یار کی راہیں

احساں تھے غریبوں پہ ترے جور و ستم بھی
ہم نے یہی سیکھا تھا محبت سے نباہیں

مرجھا گئیں مایوس تمنّا کی بہاریں
ایسے بھی ہیں انسان کہ چاہت کو نہ چاہیں

تم خوش رہو ہم تڑپیں گے اور یاد کریں گے
وہ پنکھڑی لب ۔ نیچی نگہ ۔ مرمریں بانہیں

کیا یاد تری واسطی تڑپائے گی اُن کو
دیوانہ ہے دل، ڈھونڈے ہے سپنوں میں پناہیں

دستِ نازک اُٹھے ہنگامِ دُعا میرے بعد
بخش دی آپ نے کیوں میری خطا میرے بعد

اُن کے انداز میں ہے اتنا تغیّر، شاید
میری قسمت پہ پشیماں ہے قضا میرے بعد

دوست، کر کے مری یادوں کو بہم، حیراں تھے
راز یوں میری محبّت کا کھلا میرے بعد

اُن کی زلفوں کی مہک سے کوئی بیتاب تو تھا
آہ بھرتی ہے فضاؤں میں صبا میرے بعد

آنچل آنکھوں سے لگائے مری تربت کے قریب
چپکے چپکے کھڑی روتی ہے وفا میرے بعد

تھا اگر انصاف تو کیا، گر نہ تھا انصاف تو کیا
جو کیا آپ نے مجھ سے، جو ہُوا میرے بعد

کیسے اغیار کے سینوں سے تڑپ کر نکلے
ایک طوفان بگولوں کا اُٹھا میرے بعد

عشق از قسمِ حماقت ہے، کہا لوگوں نے
بوالہوس عقل کے پردوں میں چھپا میرے بعد

شمع روشن تو سہی دیدۂ بینا نہ رہا
واسطی ہو گئی تاریک ضیا میرے بعد

○

مطمئن ظلم کے واروں پہ کھڑی رہتی ہے
زندگی غم کے سہاروں پہ کھڑی رہتی ہے

منتظر دل ہے سحر تک یہی نظّارہ ہے
اک پری چاند ستاروں پہ کھڑی رہتی ہے

خوف مرجھانے کا ہے خوابِ چمن پر طاری
یوں خزاں دِل کی بہاروں پہ کھڑی رہتی ہے

ایک آفت ہیں خیالات کے بہتے دریا
آرزو غم کے کناروں پہ کھڑی رہتی ہے

چھیڑیئے تو ابھی رقصاں ہے ترنّم بن کر
یادیوں ساز کے تاروں پہ کھڑی رہتی ہے

مرگ بھی منتظرِ غمزۂ دلبر ہے کہ آئے
یعنی قِسمت کے اشاروں پہ کھڑی رہتی ہے

زندگی واسطی بن جاتی ہے طوفان کبھی
اور کبھی وقت کے دھاروں پہ کھڑی رہتی ہے

○

ڈرتے تھے۔ زخمِ دل کو نمایاں نہ کر سکے
معصومئ حسیں کو ہراساں نہ کر سکے

اک لمحہ یوں دراز ہوُا ، موت آگئی
ہم انتظارِ جنبشِ مژگاں نہ کر سکے

ہوتے کچھ اُن کے غم سے عدو مضطرب مگر
اتنا وہ اہتمامِ شہیداں نہ کر سکے

یادیں فصیلِ شب سے ہوئیں دل پہ سنگسار
انجم ہمارا بخت فروزاں نہ کر سکے

احساسِ دردِ دے کے ہمیں درد کیوں دیا
یزداں سے ہم شکایتِ یزداں نہ کر سکے

مایوسیوں سے ایسی خزاں دِل پہ چھا گئی
جانِ بہار جس کو بہاراں نہ کر سکے

تھی بات آبروئے محبت کی واسطے
ہم مِٹ گئے۔ وہ قتل کا احساں نہ کر سکے

○

دُودھ کے ساتھ وفا بھی دی تھی اُس ماتا کے جائے ہیں
لاج بچپن کی رکھنے والے لوبھ سے کب للچائے ہیں

رستہ لمبا اور پتھریلا ، ملا ٹھکانا بیٹھ گئے
اس رستے پر اک دیوی کے سینکڑوں مندر آئے ہیں

پیت پیاسی آتما اپنی دَھن کی داسی بن نہ سکی
پیت کا دُکھ بھی سُکھ ہے! اتی مورکھ من کے سائے ہیں

شاہوں کی سب شان تو دیکھی اپنی آن پہ دھیان رہا
دُکھ بیداد کے ہاتھوں پاکر گیت خوشی کے گائے ہیں

پل پل جانچ کے دن گذرا ہے تارے گن گن رَین کٹی
پیا مِلن کی آس لئے اپنے نین بہت ترسائے ہیں

پہلے ہی سے سوچ مسافر اگلی کون سی منزل ہے
لاکھوں قافلے صحراؤں میں گم ہو کر پچھتائے ہیں

رَین کی اب گھمبیرتا ٹوٹی ، داسطی پورب بیکل ہے
مدھم شمع ہوئی جاتی ہے۔ تارے بھی کملائے ہیں

میری ہستی نازِ بے پرواۓ دوست
جان میری خونبہاۓ خونِ ناز

بارِ فطرت، رازِ انجم، یعنی کیا
دل ہے محوِ مستیٔ افسونِ ناز

حُسنِ عالم، جلوۂ خواب و خیال
پردہ دارِ معنیٔ مضمونِ ناز

ہوش میں صحرائے خشک و بے سراب
خواب میں ہے جلوۂ جیحونِ ناز

دل کی بے پروائیاں ہیں واسطی
ہے جو مسرورِ جفا، محزونِ ناز

حیران چشمِ عشق عجب رازِ اختر است
دور از زمیں جہانِ امیدِ منوّر است

زانوئے التفاتِ ستمگر، بزار حیف
سر زیرِ بارِ منّتِ بالینِ بستر است

تیغِ تبسّمِ لبِ اغیار و خشمِ تو
تسلیم و سرگرانی ہمہ دو بسر در است

اے وائے سوزِ عشق کہ جان نالۂ سپند
در جستجوئے دید نگہ دودِ مجمر است

ہر قطرہ خوں زغم تپشِ تیز در گرفت
ہر رگ طلسمِ سلکِ فروزانِ گوہر است

در بزمِ غیر جورِ تغافل، بچشمِ شرم
اے واسطی بردکہ غریبے ستمگر است

○

چو اعتبارِ وفا دارئے نگار برفت
گذشت تیر ز دل، چشمِ انتظار برفت

ہنوز یاد دلم را تپیدہ ئے دارد
ہنوز درد بجائے ازاں کہ خار برفت

جزائے شرکِ خدا در حیات می یابم
جہنّمے بہ نظر ہست چوں نگار برفت

چہ واسطی بکنی عمرِ خولشین برباد
چرا برائے گذشت از دِلت قرار برفت

○

کردم نہ نیک و بد کہ وفا فرصتم نداد
آوارہ ام بہ حشر کہ آں یارِ من کجاست

سانیٹ

وطن سے دُور

بہت سے برّاعظم درمیاں میرے تمہارے ہیں
ہوائیں اور سمندر ، کرۂ ارضی کی گولائی
کہیں ہیں تلملاتی بجلیاں ، طوفان سودائی
کہیں روشن ہے سورج اور کہیں چاند اور تارے ہیں
کہیں بستے ہیں ظالم اور کہیں قسمت کے مارے ہیں
جنوں انساں کُشی کا ہے کہیں ہے زر کی لیلائی
تخالف مذہبوں کا اور غُلامی اور دارائی
تپیدہ نبضِ وقت اور زندگی کے تُند دھارے ہیں

کہیں ہو تم افق کے پار اک دالان میں شاید
توجہ ہے چچی کی بات میں یا گھر کے کاموں میں
ممانی گھر گئی ہیں آکے بچوں کے سلاموں میں
بہت الجھی ہوئی ہو خدمتِ مہمان میں شاید

مجھے تم مُسکرا کے یاد کرنے سے بھی ڈرتی ہو
فقط بچے کو چھاتی سے لگا کر پیار کرتی ہو

امانت

نظامِ جنبشِ فطرت، ستاروں کی حسین مستی
کسی اعلےٰ تر انساں کی طرف صدیوں سے کوشاں ہے
وہ یزدانِ زمیں جو شاہدِ دنیائے امکاں ہے
وہ جس کو رفعتِ امکاں بھی ہوگی منزلِ پستی
عیاں کر دے گا جو انساں پہ انجم کی نگوں دستی
وہ شہکارِ ازل جو خوابِ مستقبل میں پنہاں ہے
وہ جس کے خوف سے تقدیر کی تقدیر لرزاں ہے
اسی تعبیر "کن" کے واسطے ہے مضطرب ہستی

وہ اعلےٰ منتہائے ارتقائے آدمیت بھی
خمیرِ آدمیت کے جواہر کا امیں ہوگا
ودیعت ہونگے اُس کو علم و عقل اور حُسن والفت بھی
وہ انساں ہوگا اور انسان کا بھی جانشیں ہوگا

مری جاں! تم امینِ عظمتِ آئندہ ہو۔ جانو
محبت کرنے والے سے یہ ضد اچھی نہیں۔ مانو

مجُاہد کی الوداع

سرمرا زانوئے سیمیں پہ پڑا رہنے دو
اور مجھے کرنے دو پیار اور مجھے پیار کرو
اپنے اظہارِ محبّت سے نہ یوں عار کرو

وقت باقی نہیں اب شرم وحیا رہنے دو
رنج فرقت کا بہت دیکھ لیا۔ رہنے دو
اب نہ مجھ کو مری جاں جان سے بیزار کرو
پیار لو، پیار کرو، پیار کا اقرار کرو
اب حیا رہنے دو، اب نازو ادا رہنے دو

آسماں پر ہے غضب شور زمیں ہلتی ہے
جنگِ طیّارہ ہے واں، آگ کی بارش ہے یہاں
گرد سے، چیخوں سے، ظلمت سے ہے معمور جہاں
حدِ جہنّم کی مگر آکے یہیں ملتی ہے

الوداع! حرمتِ اسلام پہ مرجاؤں گا
یاں سے جاؤں گا تو پھر جاں سے گذر جاؤں گا

اِنتقام

ہوئی تاریک ہستی ۔ آہ ! وہ بھی بے وفا نکلا
گھٹے تاروں کے رخشاں سانس ، اور دنیا کی بنیادیں
ہلیں ، اور بن گئیں چیخیں تمنّاؤں کی فریادیں
گئی شب ہانپتی غصّے میں اور دن کانپتا نکلا
نظر آیا تھا کیا خوابِ محبّت اور کیا نِکلا
تقاضائے جنوں تھا آبروئے عِشق لٹوادیں
کِسی بے مہر کو ہم بے وفائی میں بھی شرما دیں
کماں ٹیڑھی ہوئی گردوں کی اور تیرِ قضا نِکلا

نہ تھی دل میں محبّت گو نگا ہوں سے حسیں سمجھا
خرد نے خودکُشی کی ۔ اِنتقامِ جورِ بے پایاں
ہوُا محسوس شیریں ۔ یاد آئی تلخئی ہجراں
فریبِ نو کو ہی تعبیرِ خوابِ اوّلیں سمجھا

مری جاں ! بخش دے ۔ انساں ہوں فطرت کا تقاضا تھا
مری لغزش مگر تیری محبّت کا تقاضا تھا

نظمیں

اے ساقی!

پھر پلا بادۂ پارینہ کا جام اے ساقی
جس کی لرزش میں درخشاں ہو دوام اے ساقی

دن کو ہر سُو ہوس و مکر کی تاریکی تھی
اب تو چمکے مہِ مے، ہوگئی شام اے ساقی

ہیں تصنّع کے قدم رقص پسندوں پہ گراں
حسنِ آزاد ہو پھر محوِ خرام اے ساقی

بھُول جاتا ہے جہاں، پھر سے منادی کر دے
منتخب بادہ ہے اور دعوتِ عام اے ساقی

بادہ آشام ستاروں کو پیالوں میں پئیں
ساتھ دے جام کے آنکھوں سے پیام اے ساقی

پھر تری بزم میں مے نوش ہیں ہنگامہ بدوش
یعنی سرکارِ دو عالم کے غلام اے ساقی

چرخ تھا زیرِ قدم توسنِ تقدیر کی جب
تھام لی قائدِ اعظم نے زمام اے ساقی

عزم کہسار تھا، ایمان تھا معراجِ حیات
بات اُس کی تھی ستاروں کا کلام اے ساقی

واسطی پھر سے گھٹا اٹھی ہے، بادل چمکے
پھر پلا بادۂ پارینہ کا جام اے ساقی

سیدؔ مسعود شہاب کی شادی پر

بلبل کی گلستاں میں نوا اور ہی کچھ ہے
اور گُل کے تبسّم سے فضا اور ہی کچھ ہے

آئی ہیں بہاریں مگر ایسی نہیں آئیں
نگینئے عالم کی ضیا اور ہی کچھ ہے

اللہ نے گو حسن ہزاروں کو دیا ہے
نوشہ میں عیاں شانِ خدا اور ہی کچھ ہے

مسعوؔد کے رخسار پہ سہرے کو تو دیکھو
اِس عشق مجازی کا مزا اور ہی کچھ ہے

دُلھن بھی ہے عصمت سے شرافت سے مزیّن
سیرت ہو تو صورت کی ادا اور ہی کچھ ہے

سب کرتے ہیں محبوب سے ملنے کی دعائیں
مِل جائے تو پھر لب پہ دعا اور ہی کچھ ہے

تا روزِ قیامت یہ محبّت رہے قائم
اللہ کی عنایات سے پھولیں پھلیں دائم

بچّی کی لوری

نِندیا سنہری چومے گی آنکھیں
پریاں ہلائینگی تیرا پنگوڑا
تو مُسکرائے گی ، کھولے گی آنکھیں
تجھ کو سُلا دے گا چندا ہنسوڑا
سو جا تو پیاری ، ماں کی دُلاری
میں تجھ پہ واری ، سو جا تو سو جا

○

تو بھُول گئی ہوگی وہ بیل کسانوں کے
وہ شام گلابی سی اور کھیت وہ دھانوں کے

○

برباد کر چکی ہیں محشر بدوش آنکھیں
وہ نیم خوابیوں میں بیداریاں تمہاری

دفتر کے بابو کی فریاد

تحصیلِ تماشا کے مواقع نہیں ملتے
تسکینِ تمنّا کے مواقع نہیں ملتے

ملتے تو ہیں بیکار سے کاموں کے مواقع
طوفِ درِ لیلا کے مواقع نہیں ملتے

رعنائیاں اس بزم کی دلچسپ ہیں لیکن
اب صحبتِ اعدا کے مواقع نہیں ملتے

مخمور ہیں موجیں مہ کامل کی ضیا سے
سیرِ لبِ دریا کے مواقع نہیں ملتے

مجبور ہیں، معذور ہیں، مقفوس ہیں، محبوس
اب گردشِ صحرا کے مواقع نہیں ملتے

زاہد ہوں کہ اب فرصتِ عصیاں نہیں ہوتی
عاصی ہوں کہ تقوے کے مواقع نہیں ملتے

اے واسطی ہیں یہ غمِ امروز کے احساں
اندیشۂ فردا کے مواقع نہیں ملتے

آسیب

زلزلۂ آفت ہے برپا، تارے ٹوٹتے جاتے ہیں
آتش چشم نہنگ آوارہ بحر میں چکر کھاتے ہیں
زندہ انسانی ڈھانچے سے آپس میں ٹکراتے ہیں
تیرگیٔ دوزخ سی فضا ہے، گھُٹنے آتے جاتے ہیں
مضطر بھوت قیامت بن کر لاشوں کو تڑپاتے ہیں
میرے اقارب کندھوں پر میرا ہی جنازہ لاتے ہیں

خوفِ مجسّم خنداں پیہم ہاتھ سے میرا گلا دبائے
کوہ سیاہ سے چیخ کی گونج اور مجھ کو میری چیخ سنائے

۹

صبرِ سیاہ پوش امیدوں کی گور پر
بیٹھا ہے دل میں یاس کی دنیا لیے ہوئے

شام

جب شام کی نرم فضاؤں کو
کچھ تارے چومنے آتے ہیں
لہروں پر نرم ہواؤں کو
مہ پارے چومنے آتے ہیں
اک مستی سی چھا جاتی ہے
اور خاموشی بھی گاتی ہے

تب دل میں درد سا ہوتا ہے
میں تیری گور پہ آتا ہوں
جنگل میں اندھیرا ہوتا ہے
میں پھر بھی کچھ شرماتا ہوں
اک حالت طاری ہوتی ہے
میں روتا ہوں تو سوتی ہے

فطرت و انساں

سحر کیا انجم دا فلاک میں لہرائے ہے
چاند سے نغمۂ قدسی کی صدا آئے ہے
رازِ دل کھول دیا نکہتِ گُل نے گُل کا
اور صبا شبنمِ سیماب کو سلجھائے ہے
خوابِ خورشید سے قائم ہے طلسمِ انجم
اور سکوں رقص میں ہے خامشی کچھ گائے ہے
آہ انساں! کہ اس بزم کو برہم کردے
نغمۂ ہستی کو اک نالۂ پیہم کردے

میسّر بھی نہیں ہوتا ہمیں انصاف دنیا میں
مگر انصاف کی دل سے تمنّا بھی نہیں مٹتی

جاپانی شاعری کے زیرِ اثر

رومال ہلاتی تھی

رومال ہے تر میرا
وہ مجھ کو بلاتی تھی
جب شام پڑی ہوتی

اک حوض کنارے تو
خاموش کھڑی ہوتی
جو پایا وہی کھویا

گونج آئی پہاڑوں سے
کاٹا وہی جو بویا
اک چاند سا مکھڑا تھا

کچھ دیر ہوئی ہوگی
واں ابر کا ٹکڑا تھا
اب پتے ہی گرتے ہیں

کچھ خواب بہاروں کے
کیا ڈھونڈتے پھرتے ہیں
منزل جو ہماری تھی

تنہائی میں کاٹی ہے
جو درد کو بھی بھاری تھی

یوں شام کو گھر جاتے
جو ساتھ ہی جیتے تھے
وہ ساتھ ہی مر جاتے

گو بات نہیں ہوگی
ہے گور پہ سر میرا
تو پاس کہیں ہوگی

جا کر نہ کوئی آیا
اب رات ہے دُنیا پر
ڈھونڈیں گے کہاں سایہ

دھوکے ہیں فقط دھوکے
مایوس محبّت میں
کٹ جائے گی رو رو کے

نوٹ : کیمبرج میں ایک جاپانی دوست سے ملاقات ہوئی جن سے اکثر جاپانی شاعری کے متعلق گفتگو رہتی تھی ۔ یہ نظم انہی دنوں میں لکھی گئی ۔ دلچسپی کی ایک بات یہ ہے کہ پنجابی "ماہیا" کا بند جاپانی شاعری میں بھی موجود ہے ۔ سنہ ۱۹۶۳ء

کرشن

بنسی کی لے میں ، نغموں کی مے میں
تاروں سے اتری پریاں ہیں رقصاں
لہرا گئے ہیں شرما گئے ہیں
بے پردہ ہو کر اسرارِ پنہاں

بنسی کی لے تھی پھولوں کی مالا
یمونا کنارے پہنچا کنہیّا
کچھ گُل بچائے کچھ راہ میں کھوئے
دنیا کو جن سے رستہ دکھایا

بنسی دھر آیا ۔ آگے کھڑی تھی
رادھا اٹھائے پھولوں کی مالا
دونوں تھے ایک اور فطرت تھی حیراں
کرشنا تھا رادھا ۔ رادھا کرشنا

جانکی

اے جانکی ، اے جانکی
رہزنِ دل و ایمان کی
حیرتِ دلِ حیران کی
اے جانکی ، اے جانکی

چشموں کی دھیمی سی صدا معصوم افسانہ ترا
وہ چال مستانہ تری وہ جھوم کر گانا ترا
رہرو کی صورت دیکھ کر یونہی وہ شرمانا ترا

آزاد شہزادی ہے تو اور بے نیازِ ناز ہے
پربت کی دیوی! مضطرب تجھ میں جہانِ راز ہے
ہیں چوٹیاں کچھ سوچ میں بادل میں اک انداز ہے
کہسار کے سایوں میں کچھ خاموش سی آواز ہے

شہروں کی بربادی سے تو ہے دور اور آزاد ہے
آزاد ہے واں معصیت معصومیت برباد ہے
واں نیکیاں روپوش ہیں اور حکمراں بیداد ہے

شہروں کے شور وغل میں تو اکثر مجھے یاد آئے گی
جھوٹ اور بناوٹ میں تری معصومیت تڑپائے گی
آزاد ہے کہسار میں شہروں میں تو شرمائے گی
اے جانکی ، اے جانکی
اے جانکی ، اے جانکی

سنتوش کماری

شملے کی سنتوش کماری   پریم پیاسی جگ کی پیاری
لب متوالے
ابرو کالے
آنکھیں صبح کے نور کے روزن
گالیں سادگیوں سے روشن
بھولے پن کی باتیں ساری   دل میں لیکن دنیاداری
شملے کی سنتوش کماری

اِس نگری کی صورت ہے تو   حُسن وگنہ کی مورت ہے تو
طرز و ادا ہے
مکر و دغا ہے
پر ہے حُسن کے پیچھے پنہاں
دنیا تیرے جور سے نالاں
بے بس عاجز اور دکھیاری   شملے کی سنتوش کماری
شملے کی سنتوش کماری

نوٹ:- شملے کے وائی. ایم. سی. اے میں ایک پروفیسر جو آج کل ہندوستان میں ہیں۔ میرے ہمراہ مقیم تھے۔ کسی سنتوش کماری کے متعلق باتیں کیا کرتے تھے۔ یہ نظم ان کی فرمائش پر لکھی گئی۔ سنہ ۱۹۳۷ء

مغربی محبُوبہ

الفت میں تری اے محبوبہ
بے سود ہے رنج اور جانکاوی
یہ حُسنِ تمنّا خیز ترا
خود وعدۂ عشرتِ دنیاوی

اس بیباکی کے سامنے کیا
پیمانِ وفا یا بدنامی
اور طرزِ نگاہ و تبسّم میں
اک دعوتِ بین الاقوامی

مشرق میں وہ احمق خاتونیں
چہروں کو چھپاتی پھرتی ہیں
رنگین و مہذب دنیا میں
عِصمت کو بچاتی پھرتی ہیں

عورت ہے ادارۂ قومی، تو
پھر پردہ و بندش در کیوں ہو
مقصد ہے منافعِ جمہوری
پھر شارعِ عام پہ گھر کیوں ہو

۱۹۳۸ء

پیرس کے نیم عُریاں ناٹک دیکھ کر!

شرماتے ہیں جذبات بایں ذکرِ زبانی
خاموش صدا چاہے ہے یوں پیکرِ مانی

رومانِ محبت کی ہیں مخمور بہاریں
خمیازہ ہے اک زرد سی فردلئے خزانی

کافر کُنِ مومن وہ نگاہِ متبسّم
آنکھوں میں معانی کہ ہوں شرمندہ معانی

سینے پہ وہ سر رکھنا۔ ادا عشق نوازی
تسلیم تنِ حُسن میں وہ وصل ستانی

آوارہ سی آنکھیں کہ حیا شوخ ہوئی ہو
افزوں کنِ دیوانگئ بوسہ فشانی

جس طرح کہ گنگا کا ہو جمنا سے تواصل
بیہوش ہوئی حسن میں مستئ جوانی

اے زہرہ کی بیٹی! تری الفت میں بہت مرد
گاتے ہوئے دل سے بنے مردودِ جہانی

اُس کشورِ لعنت میں کہ فردوس ہے تیرا
ہے موج گنہ جوئے تمنا کی روانی

رنگین ترے حُسن سے فنکارئے مغرب
باقی ہے ترے سحر سے وہ جنّتِ فانی

اس حُسنِ بلاخیز سے محتاط ہی رہیئے
اے واسطی مانا نہ ملے شعلہ بیانی

۱۹۳۸ء

آباد رہو

جو کہہ نہ سکے
وہ چھپ نہ سکا
ہم کہتے بھی کیا
گو سہہ نہ سکے

جب دیکھ لیا
اور جان گئے
ہم مان گئے
الفت ہے دغا

آزاد رہو
گو خوں ہے جگر
تم غیر کے گھر
آباد رہو

تقدیر

یک بیک سامنے آنکھوں کے فلک پار کا عکس
جلوۂ حُسن میں اُترا۔ تجھے پہچان لیا
برق لہرائی۔ چکا چوند سی کیفیت تھی
سامنا ہو گیا تقدیر ہے یہ جان لیا

بھا گئی تیری نگہ میری تمناؤں کو
میں نے اقبال کیا جُرم۔ خطا وار بنا
دل نے معصوم محبت کی سزا پائی ہے
میں گنہ گار نہ تھا اور گنہ گار بنا

میری تنہائی کے لمحے تھے لہو کے آنسو
خامشی روئی ہے یوں مرگِ جواں ہو جیسے
غم کے افسانوں کو رنگین کیا ہے خوں سے
تیری بیداد حدیثِ دگراں ہو جیسے

اب مرے حال پہ بے سود ہے یوں رو دینا
جیسے معصوم کو اک ناوکِ تقدیر لگا
تو نے مارا تھا تو خنجر ہوا دل میں پیوست
تو نے جو تیر لگایا تھا وہی تیر لگا

اب تجھے میری تمنّا کی تمنّا کیوں ہو
تجھ سے رنگین بہاریں ہیں شبستانوں میں
شعلۂ گل میں ہیں عشرت کے فسانے روشن
عندلیبوں کے ترانے ہیں گلستانوں میں

وہ بات!

خدا کا شکر ہے جو ہو گئی وہ بات ہو گئی
کسی کے پنجۂ بیداد سے نجات ہوئی

قلابے چرخ و زمیں کے ملے۔ جہاں بدلا
منافقت تھی محبت۔ نفیِ ثبات ہوئی

یقیں تھا عہد پہ۔ بیتاب تھے، قیامت تھی
عیاں فریب ہوا، پُرسکوں وہ رات ہوئی

اندھیرے چھَٹ گئے۔ اب واسطی سحر پھوٹی
خدا کا شُکر ہے جو ہو گئی وہ بات ہوئی

○

جستجوئے سراب میں کیوں دِل
اِس قدر بیقرار ہے اپنا

از مسوّدہ ڈرامہ "خونی انجام"

(نظمِ معرّا)

سنبھلیں تو کس طرح سے کہ سر پر حیات کے
طوفانِ وقت دوڑتا ہے چیختا ہوا
ماحول تیرگی کا ہے۔ اوپر ہیں رعد و برق
بادل سیہ جھومتے آتے ہیں۔ راہ گم
ہے اور غار گونجتے ہیں۔ دور سے کہیں
آوازِ ہولناک۔ صدائے مہیبِ بحر
بحرِ دوامِ غم، غمِ ہستی و بعد ازیں
کانوں میں آ رہی ہے۔ خود انساں کے دل میں بھی
ہے خوف و بے یقینی و احساسِ بے کسی
بے اعتمادیوں کے ہیں آسیب ہم سفر۔
لیکن افق پہ ایک کرن روشنی کی ہے
ہلکا سا اک نشانِ سحر، اختتامِ شب

اے خدا!

مضطرب ہے میری آنکھوں میں حسیں دنیا کا خواب
یعنی تقدیرِ جہاں
ابتدائے منتہائے ارتقا
اور انساں کی خزاں کا اختتام
اک نیا خورشید اک رنگیں سحر
اک نئی دنیا ، نئی دنیا کا خواب

ہر جگہ انصاف کی ہوگی حکومت اور ضمیر
ہو سکے گا تند جلّادِ سکون و عافیت
تیوری فاتح کی ، بے انصافیاں قانون کی
امتیازِ رنگ و مذہب ، بندہ و خواجہ کا فرق
بے نشاں ہو جائیں گے۔
آرزو الفاظ کے پیچھے نہ چھپ جائے گی اور
شرم ، چاہِ بابلیں

جس میں آویزاں گناہِ سرنگوں۔
صبر، حسنِ روئے خلق
نہ کہ اک تلخی ہماری زندگی کے جام میں
اور ہر انساں برابر دوسرے انسان کے
مالک و مختارِ قسمت
حصّہ دارِ رازِ حکمت
تابعِ آئین و فرماں سازِ دربارِ حکومت
یعنی ہر انساں برابر دوسرے اِنسان کے۔

چونک اٹھتا ہوں مگر جب دیکھتا ہوں گرد و پیش
زندگی کے تلخ منظر
روح سوز و گریہ ریز
نوجواں اپنی جوانی کے اسیر
اور بچّوں کے گلوئے نازنیں کو گھونٹتی
انگلیاں غربت کی اور بیداد کی
اور ہر سو اک فضا پھیلی ہوئی تاریک دُھند
جس میں لرزاں
دشمنی، بغض و حسد، غدّاریاں، مکّاریاں

سادہ روپرکاریاں
ناداریاں، بیکاریاں، مجبوریاں، رنجوریاں
بندگی، بیچارگی
آہ! دنیائے حقیقت اور رنگیں خواب کے
درمیاں
کرب، احساسِ مصیبت، عزم، امید و ہزیمت
گریہ، یاس و سعیٔ لاحاصل کا خوف
اور خون
خون، خون، انساں کا خون!

یاخدا! یہ وقت ہے اعجاز کا
اپنے انساں کو خلیل اللہ بنا
اور جہنّم کو بنا دے گلستاں
اس ستارے کی طرف دیکھے ہے ساری کائنات
منتظرِ فطرت ہے اب اعجاز کی
اے خدا! اے آسمانوں کے خدا!

۱۹۳۹ء

بکھرے بند

اِک جام میں پانی لرزے اور سورج کی کرن اُس پر چمکے
اور عکس اس پانی کا دیوار پہ برقِ تپاں بن کر چمکے
یوں دل مضطر ہے سینے میں

جنگل میں گذرتے ہوں تنہا اور چاند پہ بادل آ جائیں
منظر کا گلا شب گھونٹ دے اور ہم تیرگیوں میں گھبرائیں
وہ گھبراہٹ ہے جینے میں

گو کئے تیرے پرستار نے پیہم سجدے
سالہا سال گذرتے رہے اور کچھ نہ ہوا
اُس کے سینے میں بھڑکتی ہوئی امّید کے خواب
سر پٹختے رہے ، مرتے رہے اور کچھ نہ ہوا

جو آسماں سے تری چھت پہ اک ستارہ گرا
بہت ہی دور تھا مَیں اور بہت ہی خوف آیا
خدا کرے کہ مریجاں کی جان ہو محفوظ
اکیلی رہتی ہے ۔ اُس کا مکان ہو محفوظ

دو دو شعر

1-4

آؤ گے بھی کبھی کہ فقط آئے جاؤ گے
اِترائے جاؤ گے یونہی شرمائے جاؤ گے

برسوں کی راکھ میں جو بجھے سے پڑے تھے تم
اُن کوئلوں کو چھیڑ کے سلگائے جاؤ گے

یقیں مانو کہ رازِ دردِ دل رازِ نہاں ہوگا
لحد کی تنگ تنہائی میں ہوگا گر عیاں ہوگا

خدا کی مہربانی ہو تو وہ بت مہرباں ہو جائے
جو وہ نامہرباں ہے تو خدا نامہرباں ہوگا

ناز میں حسن کی تدبیر رقم ہوتی ہے
آنسوؤں میں مری تقدیر رقم ہوتی ہے

یہ ترے حسن کا اعجاز ہے۔ کچھ اور بھی ہے
خونِ دل سے تری تصویر رقم ہوتی ہے

یاں گرد و نواح میں چین نہیں سینے میں اطمینان نہیں
احسان تھے اُن کے جور مگر اب جور کے بھی احسان نہیں

جب آس نہ تھی مایوسی کیوں۔ اقرار نہ تھا گِلہ کیسے ہو گلہ
الفت کے تقاضے کیا جانیں الفت کی جنھیں پہچان نہیں

آئے خفا ہوئے سے اُٹھے اور چلے گئے
ملنا ہے گر یہی تو ملاقات کیا ہوئی

لوحِ جبیں پہ آئے شکن ان کی اور یاں
دیوانگی کی پھر درِ دل پر صدا ہوئی

جینا وہ الم ہے جو ہم سے نہ سہا جاتا
پر موت بھی غیروں کی حسرت نظر آتی ہے

تعریف و تعارف کیا؟ ہے غیر۔ یہ پہچانا
مردود کے چہرے پر لعنت نظر آتی ہے

یقیں تھا خواب میں ہم کو کہ خواب خواب نہ تھا
سراب کو بھی سمجھتے رہے سراب نہ تھا

وہ کچھ تو کہتے کہ ہم کچھ جواب دے سکتے
وہ مسکرا دیئے۔ اِس ناز کا جواب نہ تھا

تم وفادار ہو عدوں کے تو جھگڑا کیا ہے
غیر کو دی تھی وفا کی جو قسم۔ بھول گئے؟

کیا کہا۔ عشق ہے اَوروں سے ہمیں؟ کہئے انھیں
یہ وفا کیش نہیں۔ پہلے صنم بھول گئے

مے پہ لڑ بیٹھے کسی ساقیئے بے پیر کے ساتھ
ہیں پشیماں کہ بڑھائی بتِ کشمیر کے ساتھ
منظرِ برق و شرار و تپِ موج و سیماب
ایک دنیا میں ہے لرزہ تری تقریر کے ساتھ

دِل میں اک آواز ہے جیسے کہ صحرا میں پکار
گو نہ آئیں در ہے لرزاں۔ انتظار آنے کا ہے
ہاتھ اپنا تھام لیتا ہوں میں گا ہے ہاتھ میں
یوں کہ جیسے ہاتھ اپنا ہاتھ بیگانے کا ہے

فردیات

تجھے دیکھا۔ حسیں سمجھا۔ محبّت تجھ سے کی ہے میں نے
ترے پاؤں پہ رکھدی لا کے اپنی زندگی میں نے

کسی کو دیکھ لینا، بھول جانا اور جاں کھونا
نگاہوں میں نگاہیں ڈال دینا اور غش ہونا

میں نے نگاہ کی تو وہ بیگانہ بن گیا
اُس نے نگاہ کی مجھے اپنا بنا لیا

خیال الجھتا نہ اپنا کسی کے بالوں میں
سیاہ رات گذرتی نہ اپنی نالوں میں

تمہارے حسن کا دامن نگہ سے چھوٹ گیا
کہ آسمان پہ گویا ستارہ ٹوٹ گیا

احساسِ حسن نے تجھے بیتاب کر دیا
کچھ رازِ خفا تری نگہ گاہ گاہ میں

یوں بیرُخی سے بزم میں رسوا نہ کیجئے
اور کوئی جب نہ دیکھے تو دیکھا نہ کیجئے

دنیا تو الم کا گھر ہے یہاں کیا شکوہ جفاؤں کا اُن کی
فردوسِ تصوّر میں آکر وہ خود ہی پشیماں ہوتے ہیں

کِس کو یقیں ہے عہد پہ لیکن ہے دِل کو بیکلی
دن بھی سیاہ ہو گیا رات کے انتظار میں

خاکساری کا برا ہو۔ پائے دشمن کے لئے
میری خاکستر کے ذرّے کوئے جاناں بن گئے

اک تشنہ لب فلک پر خوابِ سحاب دیکھے
اب یاس میں ہماری حالت یہ ہوگئی ہے

پھر جمع حسرتیں ہوئیں سر پیٹتی ہوئی
آباد پھر ہوا مرا ماتم سرائے دل

ہے ان کے سلوک اور روشِ غیر میں نسبت
الطاف و عنایات سے ہوتا ہے گماں اور

چڑھی ہے تیوری غیظ و غضب ہے چتون پر
فقط سلام کیا ہے، کہا تو کچھ بھی نہیں

رشکِ غربت تھا وطن آنکھوں میں تیرے ہجر سے
یاد ہی تیری وطن زار اب مجھے غربت میں ہے

گو ہے یقیں کہ اب وہ نہ آئیں گے عمر بھر
دل پھر بھی کھا رہا ہے فریب انتظار کا

نالۂ خاموش میں وا ہیں لب خونرنگِ گل
لٹ گئی صہبائے نکہت جس کا وہ پیمانہ تھا

کعبے سے دور لے گیا ہم کو جنونِ عشق
دامن پھٹا تو سینکڑوں زنار بن گئے

جنوں فزا عشوہ ہائے رنگینِ مہ لقایانِ کانگرس ہیں
وہ دلفروشانِ حُسن و خوبی ہیں جو فدایانِ کانگرس ہیں

امکان و حقیقت نے دیوانہ کیا مجھ کو
یہ بات نہ ہو جاتی وہ بات ہوئی ہوتی

اہلِ حکمت بجا ہی کہتے ہیں
بات کے زخم کا علاج نہیں

اپنی عظمت ہی اپنی عظمت ہے
عظمتِ مستعار دھوکا ہے

ہیجانِ زندگی ہمیں آتا ہے جو نظر
یہ توسنِ فنا کی پریشاں سی گرد ہے

خلائے توہّم پہ سایہ ہے ہستی
تمنا۔ عدم کی نہ ہو خود پرستی

ہستی ایک خیال سی ہے اور کون و مکاں پرچھائیاں ہیں
حُسن و محبّت بحرِ زماں پر لہروں کی انگڑائیاں ہیں

میں سُناؤں گا اُسے قِصّۂ غم رو رو کر
اور جو بول اُٹھی آپ کی تصویر کہیں

امید کا حسین فسانہ گذر گیا
آیا ہی جو نہ تھا وہ زمانہ گذر گیا

بُجھا کے غیر کی آنکھوں کے زہر میں تونے
نگہ کے تیر کلیجے کے پار کر ڈالے

گو کٹھن تھیں منزلیں لیکن سِکھایا عِشق نے
ارتقائے زندگی ہے ارتقائے آرزو

کیا اِس سے فزوں ہو گا جو گذری ہے سینے پر
اب خوف نہیں دل میں مرجائیں گے کیا ہو گا

پروفیسر ایس۔ ایم۔ جمیل واسطی

ایم۔اے (کینٹب)

کی دوسری کتابیں

☆

فکرِ جمیل (مجموعۂ کلام)

انفرادی طرز بیان میں فکر و جذبات، رُوحانی تجربے، المیہ کوائف غزل اور سانیٹ کی جمالیاتی تنظیم میں ڈھل گئے ہیں۔ پیش لفظ اردو کے مشہور ادیب جسٹس سر عبدالقادر مرحوم نے لکھا ہے آپ ایک بار پڑھ کر کئی بار پڑھیں گے۔

☆

اسلامی روایات کا تحفّظ

پروفیسر جمیل واسطی نے عروج و زوال اسلام کی وجوہات پر روشنی ڈالی ہے۔ زوالِ اسلام کی غلط تشریحات کے باعث جو ثقافتی تخریب کی تحریکات رونما ہوئیں، اور ان سے اسلام کو جو نقصان پہنچا، اس کی وضاحت کی ہے۔ طرز بیان فلسفیانہ ہے۔ اسلامی تہذیب کے تحفظ میں دلچسپی رکھنے والے حضرات ضرور مطالعہ فرمائیں۔

جنگل کا جزیرہ

(ناول)

دو تہذیبوں کا تقابل۔ حق و باطل کی جنگ۔ ہمارے معاشرہ پر مغربی تہذیب کے تباہ کُن اثرات پر چھپی ہوئی طنز۔ ایک رُوح پرور رومانی داستان۔ احساسِ فرض اور جذبۂ محبت میں کشمکش۔

چمن لٹ گیا

(ناول)

بدلتے ہوئے معاشرے کے حقائق۔ روایتی اقدار و اخلاق کی شکست رومان کی تلاش میں حقیقت سے فرار اور اس کے ہولناک نتائج۔ ایک دلکش داستان۔ صاحبِ ذوق حضرات کے لئے ایک معیاری ناول۔ آپ شروع کر کے ختم کئے بغیر نہ چھوڑ سکیں گے۔

ملنے کا پتہ:۔ **عالیہ پبلشنگ ھاؤس** ۔ اردو بازار، کراچی